
۱۹۶۵
شہزادہ سلیم

شہزادہ سلیم نے یہ کتاب لکھ کر ایک خلاء کو پُر کیا ہے اور اس کی اشاعت کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ان حالات کو دستاویزی شکل میں آنے والی نسلوں کے لئے پیش کرنے کی اس اہم ضرورت کو شہزادہ سلیم صاحب نے کما حقہٗ پورا کر دیا ہے۔ اُن کی یہ جرأت مندانہ تصنیف، جس میں انہوں نے انتہائی بے جگری کے ساتھ متعدد مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ متعدد واقعات کو صحیح انداز میں پیش کیا ہے، قابلِ صد ستائش و مبارکباد ہے۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جسے بہت پہلے پورا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق اب بھی منظرِ عام پر آئی تو بہت درست آئی۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں اس کی کم از کم ایک کاپی ضرور موجود ہو۔

سیّد محمد علی (شہابؔ لکھنوی)
مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۹ء
۱۹۔ ڈی کنوڈ فرلین۔ کلکتہ ۱۴

١٩٦٥

(جب مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی)

شہزادہ سلیم

مصنف کا نام	:	شہزادہ سلیم
پیدائش	:	۱۶ر اگست ۱۹۳۶ء
پتہ	:	۱۴/بی، گوراچاند روڈ، بنیاپوکھر کلکتہ-۱۴
مشغلہ	:	فلم، صحافت، تجارت، سیاست
تعداد اشاعت	:	۱۰ ہزار
سالِ اشاعت	:	ستمبر ۱۹۸۰ء
قیمت	:	بیس روپے
کتابت	:	محمد فیض، فتحیاب عالم
سرورق	:	علیم اللہ صدیقی
طباعت	:	فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، کلکتہ ۱۶

ناشر

"ہلال" پبلیکیشنز

۹ ہرن باڑی فرسٹ لین - کلکتہ - ۷۳

فون : ۲۷۵۰۷۴

میں اپنی اس تصنیف کو

مغربی بنگال میں مسلمانوں
کے قومی، ملّی، سماجی، مذہبی، تعلیمی اور فلاحی اداروں
کے روحِ رواں جناب (مرحوم) الحاج جی۔ ایم طاہر
(جی۔اے رندھیرین پرائیوٹ لیمیٹڈ) کے نام معنون کرتا
ہوں۔ جن کی روشن خیالی، وسعتِ ذہنی اور دل کی
دردمندی نے مسلم قوم کی اندھیری رہ گذر پر رہتی دنیا
تک روشن ہونے والے کئی چراغ جلائے ــــــ

شہزادہ سلیم

پیش لفظ

۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے موقع پر ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ان کی اپنی حکومت نے جو سلوک کیا تھا وہ اتنا فرقہ پرستانہ تھا کہ سیکولرزم کی وہ سنہری نقاب تار تار ہوگئی تھی جو اس نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھی تھی۔ تقسیمِ ملک کے بعد سے حکومت ہند کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے ساتھ بیرونی دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے جس کے تمام شہریوں کو بلا لحاظ مذہب و ملّت یکساں حقوق حاصل ہیں اور ملک میں وقتاً فوقتاً ہونے والے اینٹی مسلم فسادات کا سرکاری پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اگرچہ حکومت کے اس پروپیگنڈہ سے کبھی متاثر نہیں ہوئے تھے اور اپنی حقیقی پوزیشن کو خوب سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں کا ایک گروپ ضرور ایسا تھا جو غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا اور جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ مسلمان برابر کے شہری نہیں ہیں اور بڑے سیاسی عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر محض ایک نمائشی فعل ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران رونما ہوالے واقعات نے اس کی تمام خوش فہمیوں کو دور کر دیا اور بیرونی دنیا کی طرح وہ بھی حیرت کے ساتھ یہ دیکھتا اور سنتا رہا کہ مسلمانوں کی ملک گیر گرفتاریاں ہو رہی ہیں اور

چھتری برداروں کے نام پر عام مسلمانوں کی آزادانہ نقل و حرکت محال ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں کیلئے ہندوستان ایک بڑے قیدخانہ میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک طے شدہ پالیسی کے تحت مسلمانوں میں اتنی دہشت پھیلادی گئی تھی کہ وہ لوگ بھی قیدیوں ہی کی زندگی بسر کررہے تھے جنھیں باضابطہ جیلوں میں نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ شہری مسلمان اپنے علاقوں اور دیہی مسلمان اپنے مواضعات سے باہر نکلتے ہوئے گھبرانے لگے تھے کیونکہ چھتری برداروں کے نام پر زدوکوب اور گرفتاریوں کے واقعات عام ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کو پاکستانی ایجنٹ اور جاسوس قرار دیا جاچکا تھا اور اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو اشارۃً یہ بتادیا گیا تھا کہ ان پر نظر رکھنا اور اس کی سختی سے نگرانی کرنا ان کا فرض ہے۔ اکثریتی فرقہ میں بھی یہ کام راشٹریہ سویم سیوک سنگھ والوں نے چونکہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اس لئے مسلمانوں کے مصائب میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

اس طرح ستمبر ۱۹۶۵ء کا یہ دور ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اگست ۱۹۴۷ء کے دور سے بھی اہم تھا اور اگر کوئی فرق تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں صرف شمالی ہند کے مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا تھا جبکہ ۱۹۶۵ء میں پورے ملک کے مسلمانوں کو خوف و ہراس میں مبتلا ہونا پڑا تھا۔ ان حالات میں ۱۹۶۵ء کو ۱۹۴۷ء سے بھی زیادہ اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔ آزادی کے اٹھارہ سال بعد سرکاری طور پر مسلمانوں کو بھیانک انداز میں یہ بتایا جارہا تھا کہ ہندوستان میں ان کا وجود انتہائی ناپسندیدہ ہے کیونکہ کسی بھی نازک موقع پر ان سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

۱۹۶۵ء کے بعد مسلمانوں کے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی میں کوئی حقیقی تبدیلی

ہوئی ہے یا نہیں اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک گروپ ۱۹۷۱ء کی جنگ کو سامنے رکھ کر یہ کہنے لگا ہے کہ حکومت ہند کی پالیسی بدل گئی ہے اور ۱۹۶۵ء کے واقعات کا اعادہ نہیں ہو سکتا لیکن دوسرے بہت سے مسلمان اس اندازِ فکر سے متفق نہیں ہیں اور ان کی اپنی یہ قطعی رائے ہے کہ بنگلہ دیش کی تحریک اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہند پاک جنگ کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت محض اس لئے نہیں محسوس کی گئی تھی کہ پاکستان کی فوجی طاقت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اس کی بدترین شکست کا پیشگی یقین ہو چکا تھا اور اس جنگ کے دوران ہندوستان کو ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی خطرہ نہیں لاحق ہوا تھا۔

دونوں میں سے کون سا گروپ درست ہے اس کا اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا اور مستقبل ہی اس کا فیصلہ کرے گا اور ان حالات میں اگر بہت سے مسلمان اپنے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہوگی۔ دراصل یہ وہ پہلو ہے جس کے پیش نظر ۱۹۶۵ء کے واقعات کو ایک قصہ پارینہ تصور کر کے فراموش کر دینا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوگا اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس وقت کے کچھ واقعات کو کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔

جنگ کے دوران پورے ملک میں کیا کیا ہوا تھا اس کو احاطہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوا کہ کلکتہ اور اس کے اطراف میں ہونے والی گرفتاریاں اور گرفتار شدگان کے ساتھ جیل میں ہونے والے سلوک کو پیش کیا جائے۔

مجھے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ اور کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ اوّل تو ایک طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے جذبات میں وہ شدت باقی نہیں رہ گئی ہے جس کی اس وقت کے حالات کی عکاسی کے لئے بڑی ضرورت ہے اور پھر وہ قادر الکلامی بھی میرے حصہ میں نہیں آئی ہے جس کے بغیر منظر کشی کرنا اور سماں باندھنا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ امید ہے کہ قاری اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھیں گے اور میری کاوش کو صرف اسی نقطہ نظر سے دیکھیں گے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ہولناک ڈرامے کے کچھ حصہ کو کتابی شکل میں لا کر آئندہ کے لئے محفوظ کرنے کا مقصد پورا ہوا ہے یا نہیں۔ آزادی کے بعد کے دور میں مسلمانوں پر کیا گزری، آنے والی نسلوں کو اس کا صحیح اندازہ صرف اسی وقت ہو سکے گا جب آج کے مسلمان ان کے لئے تحریری شکل میں کچھ چھوڑ دینگے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ لکھا جاتا رہتا ہے جن سے آنے والی نسلیں استفادہ کر کے اس دور کے مظالم کا اندازہ ضرور کر سکیں گی لیکن ۱۹۶۵ء کے اس واقعہ پر اخبارات کے فائل بھی کوئی روشنی نہ ڈال سکیں گے کیونکہ سرکاری جبر و تشدد کی وجہ سے اخبارات ہندوستانی مسلمانوں پر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہونے والے مظالم پر روشنی نہیں ڈال سکے تھے۔ مثلاً پرانے اخبارات میں مشتبہ پاکستانی چھتری برداروں کو پکڑنے کے واقعات کی اکا دکا خبریں تو نظر آجائیں گی لیکن ان سے یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ چھتری برداروں کا ہوّا مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور ان کی نقل و حرکت کو محدود کرنے کی ایک طے شدہ پالیسی کے تحت کھڑا کیا گیا تھا۔ اسی طرح کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ہسٹریا اتنا بڑھ گیا تھا کہ پاگل اور دیوانے بھی جاسوس قرار پا گئے تھے اور انھیں بھی جیلوں میں ٹھونس کر جیل

اسٹاف کے لئے ایک بڑا مسئلہ پیدا کر دیا گیا تھا۔ سڑکوں سے فقیر اس طرح غائب ہو گئے تھے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔

آنے والی نسلیں یہ کیسے جان سکیں گی کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں کو اتنا خطرناک تصور کیا جانے لگا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور بوڑھوں کو اسٹریچر پر ڈال کر جیل پہنچایا گیا تھا انھیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ان معذور لوگوں کو بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح ان کے گھروں سے سنگینوں کے سایہ میں نکالا گیا تھا یہ تمام باتیں آنے والی نسلوں کے جاننے کی ہیں کیونکہ صرف اسی طرح وہ اپنی پوزیشن کا اپنے اسلاف کی پوزیشن سے صحیح موازنہ کر سکیں گے۔

گرفتاریاں اگرچہ پورے ملک میں ہوئی تھیں لیکن مغربی بنگال کی شان ہی نرالی تھی کیونکہ دوسری ریاستوں کے برخلاف اس ریاست میں مسلمانوں کو اس طرح جیلوں میں ٹھونسا گیا تھا کہ "کنسنٹریشن کیمپ" کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ حکام کے عزائم کیا تھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن بارکپور پر پاکستانی بمباری کے ساتھ ہی علی پور اسپشل جیل کے "کنسنٹریشن کیمپ" میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ تمام قیدیوں کو چند رنگر یا اندرون ملک کسی دوسرے علاقہ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اسلئے کہ افواہوں میں چونکہ جیل اسٹاف کا ہاتھ ہوتا تھا اسلئے ان کو کسی نہ کسی حد تک اہمیت دینی ہی پڑتی تھی اور اس طرح قیدیوں کے ذہنی کرب میں شدت پیدا ہو جاتی تھی جیل کے اندر اور جیل سے رہا ہونے کے بعد بہت سے قیدیوں پر دل کے جو دورے پڑے تھے وہ دراصل اسی ذہنی کرب کا نتیجہ تھے۔

ان تمام باتوں کو اجاگر کرنے کی خواہش نے مجھے اس بات کے لئے مجبور کیا کہ میں اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کروں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جیلوں میں جو پرانے

ادیب اور صحافی ٹھونسے گئے تھے وہ اس کام کو سرانجام دیتے اور ہمارے جیسے لوگ ان کی صرف مدد کرتے لیکن دوسرے لوگ سامنے آنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ہی قلم اٹھاؤں اور آنے والوں کے لئے کچھ چھوڑ جاؤں۔ اس کتاب کو مکمل کرنے میں جن لوگوں نے میری مدد کی ہے ان سب کا میں شکر گذار ہوں اور ان لوگوں سے معذرت کا خواہاں ہوں جن کے نام کسی نہ کسی وجہ سے کتاب میں نہ آسکے۔ اپنے طور پر میں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ تمام قابلِ ذکر لوگوں کے نام آجائیں اور ان کی سرگرمیوں پر بھی کسی نہ کسی حد تک روشنی پڑ جائے۔

آنے والے صفحات آپ پر خود ظاہر کر دیں گے کہ اس کتاب کی اشاعت میں کافی تاخیر ہو گئی ہے۔ میں اسباب کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج جب مسودہ پریس کے حوالے کیا جا رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ ۸ ستمبر کی ہی وہ تاریخ تھی جب مسلمانوں کو علی پور جیل میں غداری کے الزام میں بند کر دیا گیا تھا۔ یوں اس گرفتاری کی آج ۱۵ ویں سالگرہ ہے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی تیزی سے بدلے ہیں۔ اندرا جی پھر برسر اقتدار آگئی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں نے دوبارہ اطمینان کا سانس لیا ہے لیکن مراد آباد جیسا عظیم المیہ بھی رونما ہو چکا ہے۔ یہ کتاب، مجھے امید ہے کہ اب مزید توجہ اور سنجیدگی سے پڑھی جائے گی۔

شہزادہ سلیم
۸ ستمبر ۱۹۸۰ء

ایک مقصد —
— ایک مطالبہ

مقصد:۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی انگریزی راج کے خلاف پہلی جنگ تھی اور شکست بھی انھیں کی شکست تھی۔ ہندوستان کی صبح آزادی بھی مسلمانوں کے خون سے نہائی ہوئی آئی۔

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر مٹکاف تھامس (METCALF THOMAS) لکھتا ہے کہ:۔

"یہ مسلم ذہنیت اور قیادت تھی جس نے سپاہیوں کی معمولی بغاوت کو سازش کی شکل دیدی جس کا مقصد برٹش راج کا خاتمہ تھا۔"

ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر (W.W. HUNTER) نے مسلم انقلابیوں کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:۔

"ہندوستانی مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے ملکہ (برطانیہ) کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور رہیں۔"

جلیان والا باغ، امبالہ، پٹنہ، لکھنؤ، کلکتہ سازش کیس یہ سب مسلمانوں کے

جذبۂ حریت کے آئینہ دار ہیں۔ معرکۂ نامِلی، ریشمی رومال تحریک، خلافت تحریک، اور کانگریس کو مسلمانوں ہی نے آزادی کے صحیح مفہوم سے روشناس کیا۔ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی قدر و قیمت بتائی۔ اپنے خون سے آزادیٔ وطن کی تحریک کے پودے کو سینچا۔

مکمل آزادی کا نعرہ مولانا حسرت موہانی نے اس وقت اہلِ وطن کو دیا جب مہاتما گاندھی کے ذہن میں بھی آزادی کا تصور اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ اجاگر نہ تھا۔

مولانا محمد علی جوہر ہی پہلے ہندوستانی لیڈر تھے جنھوں نے صاف طور پر بتا دیا کہ مسلمان اپنے عقائد اور وطن کی آزادی کا سودا کسی قیمت پر کرنے کو تیار نہیں چنانچہ تقریر یاد کیجیئے :۔

"جہاں تک احکام خدا کا تعلق ہے میں اوّل و آخر مسلمان ہوں صرف مسلمان۔

"لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اوّل و آخر ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

لیکن ۴۷ء کی صبحِ آزادی نے مسلمانوں کو ہندوستان میں باوجود اپنی لاثانی خدمات و قربانیوں کے، فکری اور سیاسی یتیمی سے دوچار کر دیا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے سیلاب میں اُن کی ساری قربانیاں فراموش کر دی گئیں۔ ان کی مساجد، قبرستان، جان و مال عزت و آبرو، تہذیب و معاشرت کچھ بھی محفوظ نہ رہا۔ ان کو کہیں بھی اماں نہ ملی۔ اہل اقتدار کا مشکوک ذہن ان کے کلیجے پر ہمیشہ مونگ دلتا رہا۔ ان کی وفاداری تک مشتبہ قرار دیدی گئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پر اب بھی یہ تعصب کی تلوار لٹک رہی ہے۔

مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے بھول کر شیواجی اور رانا پرتاپ کو قومی ہیرو مانیں اور تشنۂ تشریح "قومی دھارے" میں شامل ہو جائیں۔

ٹھیک اسی طرح جیسے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے دوران یا اس سے کچھ پہلے لارڈ کیننگ کو وزیر اعظم برطانیہ نے احکام جاری کیے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد اور مسلم طرز کی ساری عمارتیں مسمار کردی جائیں اور مسلم انڈیا کے تمام نقوش یکسر مٹا دیئے جائیں اسی طرح ۱۹۴۷ء کے بعد ارباب اقتدار نے فرقہ پرستوں کی اس عظیم تر سازش کی طرف سے نظریں موڑ لیں کہ ہندوستان میں مسلم املاک کو ختم کردیا جائے اور انھیں اعصابی طور پر اس قدر مفلوج کر دیا جائے کہ یا تو اپنا سب کچھ چھوڑ کر دیار غیر کی طرف ہجرت کر جائیں یا پھر دوسرے نمبر کے شہریوں کی طرح ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک ۳۲ سال کی اس طویل مدت میں مسلمانوں پر کیا کیا مظالم ہوئے ان کو سیاسی، ثقافتی، تعلیمی، اقتصادی، ہر اعتبار سے مٹانے اور مفلوج کرنے کی کیا کیا کوششیں ہوئیں، اسکے وہ ہزاروں فسادات گواہ ہیں جن کی نہ کبھی تحقیقات ہوئی نہ اگر تحقیقات ہوئی تو اسکے نتائج برآمد ہوئے۔ مسلمان کس مپرسی کے عالم میں مشتبہ اور مشکوک شہریوں کی طرح اپنی خطرات میں گھری ہوئی زندگی کے دن پورے کرتے رہے۔

ان کے شاندار ماضی کو گالیاں دی جاتی رہیں اور وہ بے بس رہے ان کے مستقبل کو تاریک سے تاریک تر بنایا جاتا رہا لیکن انھیں اف کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

اوّل تو ان میں آزادی کے بعد لیڈر شپ کا فقدان رہا اور اگر کوئی لیڈر ابھر اٹھا،

تو اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر ارباب اقتدار ایسے پڑے کہ اسے چشم زدن میں فرقہ پرست اور وطن کا غدار بنا دیا گیا۔

۱۹۶۵ء انھیں حالات میں ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ چھڑی اور ہندوستان بھر میں لاکھوں مسلمانوں کو ایک قیامت صغریٰ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ہزاروں کو بلا کسی تصور کے ڈیفنس آف انڈیا رول نمبر ۳۰ کے تحت نظر بند کر دیا جو ان لوگوں پر لاگو ہوتا ہے جن پر حکومت کو ملک دشمن ہونے کا شبہ ہو۔ یہ رول نمبر ۳۰ مسلمانوں پر نافذ کیا گیا اور سب کو وطن کا غدار کہہ کر قید کر دیا گیا۔

اوپر دیئے گئے غیر ملکی اہلِ قلم مسلمانوں کے حریت پسند کردار کے متعلق جو الفاظ لکھے گئے تھے ان میں اور ہندوستان کے ارباب اقتدار کے قول و فعل میں کس قدر تضاد تھا اسے ۶۵ء کی ان گرفتاریوں نے ثابت کر دیا کہ نا کردہ گناہ، معصوم، پرامن غیر سیاسی، کاروباری مسلم شہریوں کو بغیر کسی تحقیقات یا چھان بین کے راتوں رات قید و بند کی ہوش ربا قیامت سے دوچار کر دیا گیا۔ ہندوستان کی پاکستان سے جنگ تھی اور قید کئے جا رہے تھے ہندوستان کے وفادار شہری خود ہندوستان کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں۔ خود اپنے ملک کی پولس نے انھیں غدار قرار دے کر جیلوں میں ٹھونس دیا تھا۔

یہ تھا اس فرقہ پرست سازش کا نقطۂ ارتقاء جو آزادیٔ ہند کے بعد سے مسلمانوں کے خلاف شروع ہوئی تھی۔ یہ تھا ایک گھناؤنا اور ذلیل ثبوت اس فرقہ وارانہ عصبیت کا جس کا ننگا ناچ ۴۷ء سے اب تک فرقہ وارانہ فسادات کے مختلف رنگوں میں

ہمارے سامنے آتا رہا تھا۔ لیکن اس سارے جور و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے کی نہ مسلمانوں میں جرأت تھی نہ اتحاد، نہ تنظیم تھی نہ وہ جذبۂ سرفروشی چنانچہ کلکتہ ہی میں جو ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور جہاں ۱۹۶۵ء میں بھی ۱۲ لاکھ مسلمان بستے تھے ہزاروں مسلمانوں کو ڈی آئی آر رول نمبر ۳۰ کے تحت علی پور اسپیشل جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور اس وقت تک نہ چھوڑا گیا جب تک ہند و پاک التوائے جنگ نہ ہو گئی اور بیشتر مسلمان تو اس کے بعد بھی بند رکھے گئے۔

گرفتار شدہ مسلمانوں میں دانشور بھی تھے، لیڈر بھی، وکیل بھی تھے ڈاکٹر بھی۔ ایڈیٹر بھی تھے، پروفیسر بھی، شاعر بھی تھے، صحافی بھی، کاروباری بھی تھے نوکری پیشہ بھی سیاسی طور پر فعال افراد بھی تھے اور غیر سیاسی لوگوں کی بھی بھاری اکثریت تھی، امیر بھی تھے غریب بھی، تاجر بھی دکاندار بھی۔ غرض کسی کو نہ چھوڑا گیا۔ کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ نوکریاں چلی گئیں، کروڑوں روپے کا نقصان ہو گیا۔ ہر ایک کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ خاندان تباہ ہو گئے۔ جمے جمائے لوگ اکھڑ گئے، بے سہارا ہو گئے۔ بے روزگار ہو گئے۔ کچھ لوگ اس صدمۂ جانکاہ سے پاگل ہو گئے، ایک لڑکے نے باپ کی گرفتاری کے دوران حالات سے مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ در جنوں نے ضعیف اور خوددار لوگ جنھیں اس ذلت اور رسوائی سے ذہنی صدمہ پہونچا تھا۔ اور جنھیں جیل میں مناسب طبی امداد نہ مل سکی تھی۔ جیل سے بیمار ہو کر باہر آئے۔ اور پھر قبر میں منھ چھپا لیا۔

جو ظلم و ستم ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں پر ہوا وہ نہ تاریخ میں پڑھا نہ آنکھوں سے دیکھا۔

ایک بھیانک اور ذلیل سازش کے تحت ہندوستان کے امن پسندی محب وطن شہریوں کو ذلیل وخوار کر کے ان کے کردار حریت کو ملیامیٹ کر کے ان کی مسلم الثبوت حب وطنی کو مشتبہ قرار دیکر انھیں چور کردیا گیا تباہ کر دیا گیا۔ ان کے معاشرے پر اس قدر مہلک وار کیا گیا کہ اس سے وہ تا حال عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔

سنہ ۶۵ء اسی سبب سے ہندوستان کے اور خصوصاً کلکتہ کے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا دوررس اثر ثابت ہوا کہ اس کی اہمیت اور اثرات کئی نسلوں تک محسوس کیا جانا ناگزیر ہوگا۔ اس قدر سنگین المیہ اور اس پر توجہ دلانے والا بھی کوئی نہ تھا مسلم عوام نے برسر اقتدار پارٹی کو سنہ ۶۷ء میں اور سنہ ۶۹ء میں دو اہم سبق سکھائے اور اسے اقتدار سے الگ کر دیا لیکن ان کے ساتھ جو ناانصافی اور زیادتی ہوئی تھی اسکا مواخذہ سامنے نہ آیا۔ مرکزی حکومت کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور دیکھتے دیکھتے ۱۵ سال بیت گئے۔ یہ کوئی پوچھنے والا نہ ہوا کہ ہندوستانی شہریوں کے خلاف یہ غیر قانونی اقدام کیوں کیا گیا۔ اس کا جواز کیا تھا اور اگر یہ اقدام غلط تھا تو مواخذہ دار کون ہے اس کی ذمہ داری کس پر ہے اور اس کا تاوان کون ادا کرے گا۔

بین الاقوامی طور پر دوسرے ممالک میں جو مہذب کہلاتے ہیں اور جن میں ہندوستان بھی شامل ہے جو قوانین نافذ ہیں ان کی رو سے اگر کسی غیر ملکی کو نظربند کیا جاتا ہے تو اس کا گذارہ دیا جاتا ہے۔ اسے باضابطہ طور پر عدالت میں یا کسی اور آئینی فورم میں پیش کیا جاتا ہے اور اگر وہ بے گناہ ثابت ہوتا ہے تو اس کا ہرجانہ یا تاوان اسے

دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں تو خود ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنے ہزاروں شہریوں کو بغیر کسی وجہ سے بغیر کسی فردِ جرم کے لگائے ہوئے صرف ملک دشمنی کا الزام لگا کر نظر بند کر دیا گیا اور کسی عدالت کے سامنے انھیں پیش بھی نہ کیا گیا۔ انھیں نظر بندی کے دوران گذارہ بھی نہ دیا گیا نہ رہائی کے بعد انھیں ہرجانہ ملا۔ مغربی بنگال میں وزیر اعلےٰ پی سی سین نے خود قبول کیا کہ جو لوگ بھی گرفتار کئے گئے تھے وہ سب اتنے ہی بے گناہ تھے جیسے کہ وہ یعنی پی سی سین خود۔

اسکے باوجود مسلمانوں کو ان کی تباہی اور بربادی کا کوئی معاوضہ نہ ملا۔ ملک بھر میں کوئی بھی سانحہ ہو، کوئی حادثہ ہو، کوئی واقعہ ہو، کوئی حل طلب مسئلہ ہو، کمیشن بیٹھتے ہیں، تحقیقات ہوتی ہے۔ اب تو تحقیقاتی کمیشن کی تقرری ایک فیشن ہو گیا ہے۔ اندرا گاندھی پر کمیشن، سنجے گاندھی پر کمیشن، کانتی دلیسائی پر کمیشن، "قصہ کرسی کا" پر کمیشن غرض بھانت بھانت کے کمیشن بیٹھ رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں بھی کمیشن اور کمیٹیاں بیٹھی تھیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ اس کھلی دھاندلی۔ ان کے خلاف اس کثیف ترین سازش اور المیہ کے بارے میں کوئی کمیشن نہ بیٹھا۔ کوئی تحقیقات نہ ہوئی۔ اگرچہ ان کے کردار کی بے داغ حیثیت اس کی متقاضی تھی۔ لیکن کمیشن بٹھاتا کون۔ مجرم تو خود حکومت تھی۔ جرم تو خود اس کی پولس نے کیا تھا۔ لہذا کوئی تحقیقات نہ ہوئی، کوئی ردِ عمل سرکاری طور پر نہ ہوا اور معلوم یہ ہوا کہ واقعی مسلمانوں کو دوسرے نمبر کا شہری سمجھ کر ان کے خلاف جو بھی اقدام کیا جائے اس کا کوئی مواخذہ دار نہ ہو گا کسی طرح کا ظلم کیا جائے یہ کچھ نہ کہیں گے۔

حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اصل میں کانگریس پارٹی اور اس کی سنڈیکیٹ کی ڈکٹیٹر شپ نے اس قدر سخت پابندیاں عوام پر عائد کر رکھی تھیں۔ پریس اور اخبارات کو اس قدر پابہ زنجیر کر رکھا تھا کہ اسکی خلاف آواز اٹھانا تباہی کو دعوت دینا تھی لہذا مسلمانوں کے ساتھ اس دیدہ دلیر فرقہ پرست رویّہ پر بھی خاموشی رہی اور بظاہر یہ معاملہ ختم ہو گیا لیکن غم و غصّہ اپنی جگہ تھا جیسا کہ عموماً تواریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بے بس عوام موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور ڈکٹیٹر شپ کے خلاف غم و غصہ ختم نہیں ہوتا۔ دب ضرور جاتا ہے۔ اسی طرح اب ۱۴ سال گذرنے کے بعد جبکہ حالات وہ نہیں جو اس وقت تھے۔ کانگریس ختم ہو چکی ہے، جنتا کی گورنمنٹ بھی بکھر گئی اور وہ لوگ جو کسی نہ کسی روپ میں برسر اقتدار تھے اب کرسیٔ اقتدار پر یا تو ہیں نہیں اور اگر ہیں تو ڈکٹیٹر ڈھال کی طرح مستحکم نہیں تو ہم نے اس دیرینہ احتجاج کو دوبارہ زندہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد صرف ایک مطالبہ ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں کے خلاف جو سازش کی گئی، ان پر جو مظالم ڈھائے گئے، ان کو ناکردہ گناہ جو ملک دشمنی کا مجرم ٹھہرا کر جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ ان کی زندگیاں تباہ کی گئیں۔ ان کے کاروبار، ملازمتوں اور معاشرے کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔ اس کا انصاف کیا جائے۔ اس کی تحقیقات کی جائے۔ اگر کوئی ایک بھی مسلمان قصوروار ثابت ہو تو اس پر مقدمہ چلایا جائے ورنہ گرفتار ہونے والے ایک ایک مسلمان کے کردار پر جو داغ لگا ہے اعلانیہ اور قانونی طور پر اسے دھویا جائے۔ اسے اس کا معاوضہ دیا جائے جو مسلمان اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور ہلاک ہو گئے

ان کے خاندان والوں کو ان کی بے گناہی کا ثبوت بہم پہنچایا جائے تاکہ آئندہ کسی بھی حکومت یا پولس کو ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا کہ اب ہندوستان کی سیاسی فضا بدل چکی ہے۔ ہر پارٹی مسلمانوں کی اہمیت کا اعتراف کر رہی ہے۔ جنتا ہو، یا جنتا (ایس)، کانگریس (ایس) ہو یا کانگریس (آئی) سی۔ ایف۔ ڈی ہو یا سوشلسٹ پارٹی، سب مسلمانوں کو اولین اہمیت دے رہی ہیں۔ اس وقت سیاسی میدان میں دو بڑی تعدادی طاقتیں اہم ترین ہیں، مسلمان اور اچھوت۔ ہر پارٹی چاہتی ہے کہ اسے مسلمانوں پر جو بھی الزامات فرقہ پرستوں نے لگائے ہیں ان کی صفائی ہو جائے۔ آر ایس ایس اور جن سنگھ سے صرف علیحدگی ہی کافی نہیں ہے انھوں نے جو زہر فرقہ پرستی کا قوم کی شریانوں میں بھر دیا ہے اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے جو غلط تصوّر مسلمانوں کے متعلق بعض برادران وطن کے ذہنوں میں چھوڑا اس کا معدوم ہونا لازمی ہے۔ اور سب سے اہم کڑی اِس سلسلے کی ہے سنہ ۶۵ء میں ڈی آئی آر رول سنہ ۳۰ کے تحت مسلمانوں کی گرفتاری کی تحقیقات اور ان کی اس کثیف اقدام سے ہمیشہ کے لئے گلو خلاصی۔

مطالبہ :۔ زیرِ قلم کتاب کا مقصد ہی یہ ہے کہ اب ۱۵ سال کی طویل مدت کے بعد جبکہ حالات سازگار ہیں ہم اور ہمارے ساتھ تمام ان مسلمانوں کا جنھیں سنہ ۶۵ء میں جیل میں بے قصور ملک دشمن اور جاسوس جیسے گھناؤنے الزامات لگا کر قید کیا گیا تھا، مندرجہ ذیل مطالبہ ہے :۔

(۱) حکومت ہند فوری طور پر ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے جو سنہ ۶۵ء میں ڈی آئی آر

رد ل نمبر ۳ کے تحت ہونے والی مسلمانوں کی گرفتاریوں کی تحقیقات کرے اور یہ فیصلہ کرے کہ یہ گرفتاریاں جائز تھیں یا نا جائز۔

(۲) اگر یہ گرفتاریاں جائز تھیں تو جو لوگ گرفتار تھے ان پر مقدمات چلائے جائیں اور اگر نا جائز تھیں جیسا کہ وزیر اعلیٰ پی سی سین نے خود اعتراف کیا تھا تو ہر گرفتار شدہ مسلمان کو برائے مدّت نظر بندی گذارہ دیا جائے اور اسکے ذہنی صدمے اور کاروباری یا ملازمتی نقصان کا معاوضہ دیا جائے۔ جو لوگ نوکری کھو بیٹھے انھیں نوکری دی جائے اور جن کا کاروبار چوپٹ ہوا ان کو کاروبار کا معاوضہ دیا جائے۔

(۳) جو لوگ بے قصور ثابت ہوں انھیں کمیشن اپنے یا حکومت کی طرف سے ایک معذرتی خط بھجوائے جس میں ان کی حب وطن اور بے داغ کردار کا واضح طور پر ذکر ہو اور ان کی تکالیف کے متعلق معذرت چاہی جائے تاکہ سند رہے اور آئندہ کبھی ان کو تنگ نہ کیا جائے۔ اور حکومت کی طرف سے انھیں ہر قسم کی مراعات کا یقین دلایا جائے۔

(۴) ہمارا ہر پارٹی کے تمام ممبران پارلیمنٹ سے مطالبہ ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کی حمایت کے دل سے متمنی ہیں تو وہ حکومت ہند سے پارلیمنٹ میں مطالبہ کریں کہ وہ فوری طور پر ایک تحقیقاتی کمیشن اس سلسلے میں مقرر کرے اور اس پر عمل درآمد کرا کر ہی دم لیں۔

۵ اطویل برسوں کے بعد اِس کتاب کی اشاعت کا یہی مقصد ہے۔

.... اُن کی یادیں

بنام خادم قوم مُلّاجان محمّد صاحب رح
و مجاہد مقدم سیّد بدرُالدجیٰ صاحب

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے،
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر علامہ اقبال رح

میں اپنی اس حقیر قلمی کوشش کو جو کلکتہ اور مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لئے خاص طور پر اور مسلمانان ہندوستان کے لئے عموماً لکھی گئی ہے ان دو معزز و معظم و محترم ہستیوں کے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کرتا ہوں جن کی قومی و ملی خدمات مسلمانان ہند کی آنے والی نسلوں کو ایک مدت دراز تک یاد رہیں گی۔ خادم قوم ملّاجان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مجاہد قوم سید بدرالدجیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قوم و ملت کے ایسے دُرہائے بے بہا تھے کہ ان کی نظیر آنے والے دور میں ملنا ناممکن نہیں تو انتہائی دشوار ضرور ہے۔ نہ اب یہ رہنما لوٹ کر آئیں گے نہ خدا کرے وہ

دور لوٹ کر آئے جو مسلمانان ہند پر تقسیم ملک کے بعد گزر گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان تو آزاد ہو گئے لیکن مسلمانان ہند کے پیروں میں فرقہ پرستوں نے انہیں یرغمال بنا کر وطن دشمنی کے ذلیل الزام کی بیڑیاں اور ان کے گلے میں غداری کا طوق ڈال دیا۔ مسلمان اپنے وطن کے ایک عریض و بسیط قید خانے میں قید و بند، ظلم و ستم فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ وارانہ تعصب، امتیازی سلوک اور حقارت و نفرت کے انتقام کی سختیاں جھیلتے رہے۔ اس دور پر آشوب میں ہندوستانی مسلمانوں کی ممد و معاون، مددگار اور سرپرست، خادم و مجاہد یہی دو ہستیاں سربکف سامنے آئیں اور ان دونوں لیڈروں نے مسلمانوں کی ہمت کو جو ایک گرتی ہوئی دیوار تھی سہارا دیا۔ ان کی اشک شوئی کی، دلجوئی کی زخموں پر مرہم رکھا۔ بے باکی سے ان کی شکایات کو صاحبان اقتدار کے سامنے رکھا۔ حکومت اور حکام سے ٹکرائے پولیس کی سنگینوں کے سامنے اپنے سینے ننگے کر دیئے۔ لٹے، جلے، بے گھر مظلوم و مقتول، مجروح مسلمانوں کی امداد کے لئے جھولی پھیلا کر عوام سے بھیک مانگی اور حکومت سے انصاف۔

خادم قوم

ملا جان محمد صاحب رح علی برادران کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور خلافت کمیٹی کی روح رواں تھے انہوں نے سوشیل سطح پر اگر ایک طرف مسلمانوں کے اداروں

کی بگڑتی ہوئی حالت کو سنوارا انہیں استحکام بخشا تو دوسری طرف خود مسلمانوں کی پست ہمتی کا مذاق اڑا کر ان کی غیرت کو للکارا انہیں سماجی طور پر منظم کیا ایک دوسرے کے دکھ درد میں ساتھ دینے کا سبق دیا۔ اخوت اسلام کی علم برداری کی اگرچہ عمر آچکی تھی لیکن کمر کس کر اور ڈنڈا لے کر میدان عمل میں کود پڑے اور وہ کچھ کر دکھایا جو نوجوانوں کے بس کا نہ تھا۔ اگر ایک طرف اسلامیہ ہسپتال، کلکتہ یتیم خانہ انجمن اور محمڈن اسپورٹنگ کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا تو دوسری طرف لاکھوں روپے مغربی بنگال اور سارے ہندوستان میں ہونے والے فسادات کے شکار مسلمانوں تک پہونچائے۔ اگر ایک طرف سماجی خدمات انجام دی اور مسلمانوں کو منظم و متحد کر کے صنعت و اقتصادیات کو سہارا دیا تو دوسری طرف حکومت اور حکام سے ٹکرلی۔ فسادات کی روک تھام کی اور جب ہندوستان گیر پیمانے پر فسادات ہونے لگے تو اس کے حل کیلئے ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ میں مسلمانان ہند کی مختلف پارٹیوں کے نمایندوں کی ندوۃ العلماء میں مجلس مشاورت منعقد کی اور ڈاکٹر سید محمود کو اس کی صدارت سونپ کر خود ایک خادم کی طرح دن رات محنت کر کے مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود میں لگے رہنے کی ایک نادر مثال پیش کر دی۔ یہ اسی اتحاد اور یکجائی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو بعد میں تھوڑی عافیت نصیب ہوئی۔ فسادات کی رفتار دھیمی ہوئی۔ مسلمانوں کی اہمیت کا حکومت کو احساس ہوا۔ زبانی ہی سہی لیکن ان کی دل جوئی کی کوشش کی جانے لگی آج جو مسلمانان ہند مقابلتاً زیادہ سکون و آرام سے اپنا کاروبار کر رہے ہیں زندگی کے دوسرے شعبوں میں زیادہ آسانی

سے سانس لے رہے ہیں۔ اس میں ملا جان محمدؒ خادم قوم کا زبردست ہاتھ ہے اور کوئی بھی تحریری دستاویز اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک اس میں اس مرد بے باک کی خدمات بیش بہا کا تذکرہ نہ ہو۔

خادم قوم کے وصال پر ملال کے بعد ایک ایسا خلا کلکتہ کے مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے کہ جس کا پُر کرنا فی الحال تو ناممکن نظر آتا ہے خلافت کمیٹی اب بھی ایک دفتر کی صورت میں موجود ہے لیکن مجھے انتہائی افسوس لیکن پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ملا جان محمدؒ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا تو الگ رہا خلافت کمیٹی اب ناکاروں کا اڈہ بن کر رہ گیا ہے جس کا کام سوائے عید اور بقر عید کی نماز پڑھانے۔ اور زکریا اسٹریٹ میں دکانوں کا بند و بست عید اور بقر عید میں کر دینے کے سوا کوئی کام نہیں۔ ایک دور تھا جب کہ حکومت وقت مسلمانوں کے ہر مسئلہ پر خلافت کمیٹی اور ملا جان محمد سے مشورہ کرنے پر مجبور ہوتی تھی اب خلافت کمیٹی کے اپنے ہی ہاتھوں حکومت کا سوال تو دیگر ہے خود مسلمانان کلکتہ یہ بھولتے جا رہے ہیں کہ خلافت کمیٹی بھی مسلمانوں کا ایک فعال ادارہ تھا یا یہ کہ اس کا وجود باقی ہے کہ ختم ہو گیا۔

مجاہد قوم

مغربی بنگال کے حالات نے دوسری ہستی جو مسلمانان ہند کے افق پر آفتاب درخشاں بن کر چمکنے کے لئے پیدا کی وہ تھے سید بدرالدجیٰ صاحب مرشد آباد کے ایک

سید خاندان کا یہ چشم و چراغ جس کا سلسلہ نسب میر تقی میر سے ملتا تھا۔ نظامت مرشد آباد کے خطاب یافتہ مورث اعلیٰ کا نام لیوا تھا۔ جوانی شیر بنگال فضل الحق صاحب کی رفاقت میں گذاری اور اس وقت بھی اپنی نادر الکلامی اور شعلہ بار تقریروں سے سارے ہندوستان کے لیڈروں حتیٰ کہ محمد علی جناح سکندر حیات خاں، راجہ محمود آباد اور لیاقت علی خاں وغیرہ سے لوہا منوالیا۔ انگریزی، اردو، بنگلہ، فارسی، عربی ہر زبان میں یکساں تقریر کرتے تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے کلکتہ کارپوریشن کے میئر ہوئے اور تقسیم ملک کے بعد مرشد آباد سے متعدد بار اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اگر کسی شیر مرد کی آواز پارلیمنٹ اور اسمبلی کے کنگروں کو ہلاتی رہی تو وہ بدرالدجیٰ کی واحد آواز تھی۔

مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم، ان کی کسمپرسی اور بے بسی نے اس مرد مجاہد کا کلیجہ ہلا دیا اور یہ دل و جان سے صرف ایک موقف پر عمل کرنے میں منہمک ہو گئے اور وہ تھی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو اپنے شعلہ بار الفاظ میں دنیا کے سامنے رکھ کر اس سے انصاف طلب کرنا۔ حکومت اور حکام کی بے انصافی تھی کہ وہ بدرالدجیٰ صاحب کے خلاف حرکت میں آ گئے۔ انہیں متعدد بار جیل جانا پڑا۔ ان کے منہ پر تالا لگانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ جب ظلم کام نہ آیا تو ڈاکٹر بی سی رائے نے انہیں وزارت اسپیکر شپ، سفارت ہر چیز ان کی گویائی خریدنے کے لئے انہیں مہیا کرنے کی پیش کش کی لیکن اس مرد مجاہد نے ہر کوشش ٹھکرا دیا اور اپنا کام جاری رکھا۔ متعدد پارٹیاں بنائیں۔ لیکن مسلمانوں کے خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ وہ بدرالدجیٰ صاحب کے ساتھ اعلانیہ آنے کی جرأت

اپنے میں نہ پاتے تھے۔ کوئی پارٹی بدرالدجیٰ صاحب کو اپنانے کو تیار نہ تھی سب ان کی شعلہ بیانی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن ان مسلم دوست کردار کو فرقہ پرستی کا نام دے کر پہلوتہی کرتے تھے۔ بدرالدجیٰ صاحب ہمیشہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے مرشد آباد سے الیکشن لڑتے تھے اور مرشد آباد کے جرآت مند ووٹر انہیں ہمیشہ کامیاب بناتے تھے۔ بدرالدجیٰ صاحب نے درجنوں بار سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور جہاں فسادات ہوئے وہاں پہونچے اور مسلمانوں کی ہمت بڑھائی انہیں اتحاد اور تنظیم کی دعوت دی۔

انہوں نے اپنی زندگی مسلمانانِ ہند کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ فضل الحق صاحب جب سابق مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے تو بدرالدجیٰ صاحب انتہائی دل شکن حال اور سیاسی دشواریوں سے دوچار تھے۔ فضل الحق صاحب نے انہیں فون کیا تو وہاں نواب جانی مرزا ایم ایل اے مرشد آباد، شہاب لکھنوی اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ فضل الحق صاحب نے انہیں پیش کش کی کہ وہ پاکستان چلے آئیں وہ جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ وزارت، سفارت یا اور کچھ کردیا جائے گا۔ بدرالدجیٰ صاحب نے ایک منٹ توقف کیا اور پھر فضل الحق صاحب کو جواب دیا کہ میں تو چلا آؤں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا ہوگا ان کو کس کے سہارے چھوڑوں اور یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

ہندوستانی غیر مسلم لیڈروں میں بھی بدرالدجیٰ صاحب کی بڑی عزت تھی چنانچہ جب وہ کارپوریشن کے میئر شپ کے لئے کھڑے ہوئے تو خود نیتاجی سبھاش چندر بوس نے اپنے گروپ کے ساتھ ان کی حمایت کی اور انہیں جتایا۔ نیتاجی نے ہندوستان سے اپنی

روانگی کے متعلق جن چند افراد کو بتایا تھا ان میں بدرالدجیٰ صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ہیمنت کمار باسو نیتاجی کے چیلے مرتے دم تک ان کی عزت کرتے رہے۔ اچاریہ کرپلانی، راجہ گوپال اچاریہ اور خود نہرو ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

بین الاقوامی سطح پر بھی انہوں نے اپنی شعلہ بیانی کا لوہا منوالیا جب جواہر لال نہرو سورگ باش ہوئے تو ساری دنیا کے سربراہ دہلی میں جمع ہوئے تھے اس وقت دو آزاد ممبران پارلیمنٹ کو بولنے کی اجازت دس دس منٹ کے لئے دی گئی تھی اچاریہ کرپلانی اور بدرالدجیٰ۔ اچاریہ تو دس منٹ بول کر بیٹھ گئے۔ بدرالدجیٰ صاحب دس منٹ تک تقریر کرتے رہے پھر صدر رادھا کرشنن کی طرف دیکھا انہوں نے اور وہاں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں نے ان کی تقریر مزید سننے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ وہ ۳۵ منٹ تک بولتے رہے۔

۱۹۶۴ء میں فسادات کے بعد انہوں نے ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی وہ اپنی شعلہ بیانی اور مسلمانوں پر مظالم کی تصویر کشی کے اعتبار سے بیمثال ہے۔ اور عام خیال یہ ہے کہ اس تقریر کی وجہ سے بیرونی ہندوستان اور خصوصاً ممالک اسلام میں اس قدر ہلچل مچی کہ گورنمنٹ کو فسادات کے کچلنے کے سلسلے میں اپنا رویہ سخت کرنا پڑا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی جان بچی۔ لیکن گورنمنٹ اس تقریر کو نہ بھولی۔ حکام نے اسے یاد رکھا اور ۱۹۶۵ء میں انہیں پانچ ماہ قید رکھنے کے بعد دوبارہ قید کیا تو تین سال بعد اس وقت چھوڑا جب وہ لب گور تھے۔ ۷۵ سال کا یہ مجاہد قید و بند کی یہ آخری سختیاں اور پاکستانی جاسوس ہونے کا ذلیل الزام برداشت نہ کرسکا اور

جیل سے واپسی پر بیماری کی حالت میں داخل جنت ہو گیا۔

ایک بات انتہائی قابل افسوس یہ ہے کہ سید بدر الدجیٰ صاحب سے قوم نے انصاف نہ کیا۔ ہندوستان میں متعدد بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی لیڈر جیل میں رہ کر الیکشن لڑتا ہے تو وہ یقینی طور پر جیت جاتا ہے چنانچہ جارج فرنانڈیز وغیرہ کی مثالیں تازہ ہیں لیکن ہماری قوم اس قدر بدقسمت اور بزدل ہے کہ جب بدرالدجیٰ صاحب جیل میں رہ کر الیکشن لڑے تو انہیں مسلم لیگ کے نمائندے کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا پڑا یہ بات ہمارے لئے کس قدر باعث شرم ہے اس کا ذکر لاحاصل ہے۔

اور دوسری طرف جب وہ واصل بحق ہوئے تو ان کی نماز جنازہ جس میں ان کی اہمیت اور خدمات کے پیش نظر لاکھوں کا مجمع ہونا چاہیئے تھا اور سارے ہندوستان میں نماز غائبانہ ہونا چاہیئے تھی، صرف چار یا پانچ سو افراد شریک تھے اور مدرسہ عالیہ کے چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں بھی کافی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ اگر ہمارا یہی حال رہا تو آئندہ کون جرأت کرے گا کہ سید بدرالدجیٰ یا ملا جان محمد کی طرح سربکف ہو کر قوم کی خدمت کرے جو اس کی طرف سے یوں منہ پھیر لیتی ہے اور اس کی آواز پر لبیک کہنے کی ہمت اپنے میں نہیں رکھتی۔

جب مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی

۱۹۶۵ء کا منحوس سال مسلمانانِ ہند کے لئے عموماً اور مسلمانانِ مغربی بنگال کے لئے خصوصاً قیامت کا نمونہ ثابت ہوا۔ ویسے تو ۱۹۴۷ء کے اس المیہ کے بعد ہی جبکہ ایک ماں کے دو جڑواں بچوں کو تلوار مار کر جدا کر دیا گیا تھا اور وطن تقسیم ہو چکا تھا اس وقت سے اب تک مسلمان نہ معلوم کتنی "کربلاؤں" سے گذر چکے تھے اور نہ معلوم کتنی بار اس امید موہوم کے سہارے دوبارہ عزّت سے جینے کی جدوجہد میں مصروف ہوئے تھے کہ ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

لیکن ۶۵ء ایک انوکھی آزمائش کا دور تھا۔ دونوں بھائیوں نے ۱۸ سال سے سینوں میں لاوے کی طرح پکتی ہوئی نفرت کو جنگ کے روپ میں اگل دیا تھا۔ توپیں اور بندوقیں، طیارے اور راکٹ زبانوں کے بجائے استعمال ہو رہے تھے۔ ۶۵ء میں پہلی ہند و پاک جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

جنگ ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہو رہی تھی اور مسلمانانِ ہند یرغمال بنے ہوئے تھے۔ بقول فرینک انتھونی ایم پی "ہندستانی مسلمان کچے دھاگے سے لٹکتی ہوئی تلوار کے سایہ میں زندگی بسر کر رہے تھے"

پس منظر آیئے اصل واقعات کی طرف آنے سے پہلے ذرا اس جنگ کے وقت

برصغیر ہندوستان کے سیاسی پس منظر پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ یہ پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان میں اس وقت فیلڈ مارشل ایوب خاں کی حکومت تھی اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ صورت حال تدریج سامنے آرہی تھی جو آخر کار ایوب خاں کی دستبرداری کی محرک ہوئی لہٰذا یا سیاسیات اور خیالات کا دھارا پلٹنے کے لئے ہندوستان سے جنگ ایک خوب صورت چال تھی پاکستان کی بساط شطرنج پر۔

ہندوستان میں جواہر لال نہرو کا دور ختم ہو چکا تھا۔ لال بہادر شاستری وزیراعظم تھے اور حالات یہاں بھی سیاسی اعتبار سے مستحکم نہیں ہونے پائے تھے اندرا گاندھی خاموشی سے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر رہی تھیں۔ مرارجی دیسائی اگرچہ سمجھوتے کے وزیراعظم لال بہادر شاستری کو برداشت کئے ہوئے تھے۔ لیکن کاٹ چھانٹ، جوڑ توڑ سے یہ بھی غافل نہ تھے۔ سنڈی کیٹ کے رہنما اپنی ڈکٹیٹرشپ کو قائم ودائم رکھنے کے چکر میں تھے۔

یہ امر خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اس دورِ پُرآشوب میں مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ اگرچہ پی سی سین تھے لیکن پوری ریاست پر اتلیہ گھوش کا سایہ بہت وسیع ہو رہا تھا جو سنڈی کیٹ کے ایک انتہائی بااثر رکن تھے اور کہا جاتا تھا کہ اس وقت سنڈی کیٹ ہی کے چار لیڈر ہندستان پر حکومت کر رہے تھے۔ چنانچہ اتلیہ گھوش کل ہند پیمانے پر بھی چار ڈکٹیٹروں میں سے ایک تھے اور مغربی بنگال میں تو ان کے حکم کے بغیر پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ پی سی سین جیسا وزیراعلیٰ تو

بہرحال اتلیہ گھوش کے ربر اسٹامپ تھے۔

چنانچہ یہ تھا وہ پس منظر جس میں ہندستان اور پاکستان کی جنگ کی ابتداء ہوئی۔ مغربی بنگال کے لئے خاص طور پر یہ جنگ مسلم نقطۂ نظر سے بڑی تباہ کن نتائج کی حامل ہو سکتی تھی۔ اور ہوئی۔ سبب یہ کہ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں مسلمانوں کے خلاف خونریز فسادات ہو چکے تھے۔ ساتھ ساتھ راوڑکیلا اور جمشید پور میں بھی ہوئے لیکن جو شدت اور وسعت جانی اور مالی اعتبار سے اوسطاً کلکتہ کے مسلمانوں کے خلاف فساد کنندگان نے برتی وہ کسی اور شہر میں نہیں دیکھی گئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ فرقہ پرستوں کا جو منصوبہ مسلمانان کلکتہ سے بعض علاقے خالی کرا لینے کا تھا وہ کامیاب نہ ہو سکا اور باوجود تباہی و بربادی کے مسلمان فساد زدہ علاقوں میں پھٹے ترپالوں کے نیچے بارش میں بھیگتے فاقے کرتے اور مرتے رہے لیکن ہٹے نہیں۔ چنانچہ فرقہ پرستوں کے دلوں میں غم و غصہ بھرا ہوا تھا اور بمقام افسوس یہ ہے کہ اتلیہ گھوش اور پی سی سین کی سرپرستی میں حکام کا بھی ایک قابل ذکر حصہ اس فرقہ پرستی کے تعصب میں مبتلا تھا۔ پولیس کا محکمہ بھی اس سے بری نہ تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر اسپیشل برانچ پولیس کے ایک سب انسپکٹر بشوناتھ دوبے کا نام قابل ذکر ہے جو مسلم سکشن کا انچارج تھا یہ شخص اردو عربی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا۔ اس کی کارگذاری تھی کہ کلکتہ کے تمام بااثر مسلمانوں پُرجوش نوجوانوں، ڈاکٹروں، وکلاء، پروفیسران، غرض مسلمانوں کے ہر شعبۂ عمل کے ہر ایک اہم فرد کے خلاف کچھ نہ کچھ مواد جمع کر کے اور اس کی فائل بنائی رکھتی۔

تاکہ وقت پر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے اور ۱۹۶۵ء میں دوبے نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ نکمّے اور نااہل وزرا، اور حکام کو الّو بنا کر اپنے جاسوسوں اور انفارمروں کے ذریعہ جھوٹی رپورٹیں بھجوا کر اس نے کلکتہ کے قریب قریب ہر اس مسلمان کو جو مسلم معاشرے میں کوئی بھی اہم کردار ادا کر سکتا تھا اور اس کا معاون نہ تھا اسے دوبے نے جیل کی دیواروں کے پیچھے بھیجدیا غالباً وہ دن دوبے کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشی کا دن تھا جب کلکتہ کے ۱۳۰۸ چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم مسلمان علی پور اسپیشل جیل اور پریسیڈنسی اور سنٹرل جیل کی چہار دیواری کے پیچھے چلے گئے۔ اور ان سب باثر، شریف، وفادار، صاحب حیثیت، نسلوں سے کلکتہ میں آباد اور ہندستان کی جنگ آزادی میں اپنے خون کی ہولی کھیلنے والے مجاہدین کے پوتوں اور نواسوں پر الزام کیا تھا؟

یہ کہ وہ پاکستان نواز ہیں، پاکستان کے جاسوس ہیں، پاکستان چھاتہ بردار فوجیوں کو پناہ دیتے ہیں۔ یہ الزام لگانے والے اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے اپنی آبادی کے اوسط سے زیادہ قربانیاں دیں اردو میں جسے فرقہ پرست مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں جنگ آزادی پر سب سے زیادہ نظمیں اور مضامین لکھے گئے "ہندستان زندہ باد" کا نعرہ بھی مسلمانوں نے انقلابیوں کو سکھایا۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا قومی ترانہ جو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا اور پڑھا جاتا ہے اقبالؒ نے ہندوستان

کو دیا۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد، ملک کے تقسیم ہونے کے بعد مسلمانانِ ہند کی قربانیاں بھی یادگار ہیں۔ انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ سامنے کون ہے۔ اور اپنے وطن پر قربان ہوگئے۔ بریگیڈیر عثمان کی قربانی پاکستانی فوجوں کے خلاف تھی کشمیر کے علاقہ میں ظہور میں آئی۔ حوالدار عبدالحمید نے اپنی جان پاکستانی ٹینکوں کو تباہ کرتے ہوئے دی۔ اور یہی نہیں بلکہ ۴۷ء سے اب تک جتنے بھی ہندستانی غیر ملکی ایجنٹ پکڑے گئے ان میں سے ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ مسلمانوں کے اس بے داغ ریکارڈ کا ہندستان کا اور کوئی دوسرا فرقہ مقابلہ نہیں کرسکتا مسلمانانِ ہند کی حب الوطنی اور جذبۂ قومی کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے کارنامے تو اس قابل تھے کہ انہیں تاریخ ہندستان میں سنہرے حروف میں جگہ ملتی لیکن افسوس صد افسوس اس کا انعام انہیں یہ دیا گیا کہ انہیں پاکستان نواز اور پاکستانی جاسوس کہہ کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان میں وہ حضرات بھی تھے جنھوں نے اپنے عزیزوں سے صرف اس بنا پر قطع تعلق کرلیا تھا کہ وہ پاکستان منتقل ہوگئے تھے۔ کس قدر حیرت انگیز جذبۂ حب الوطنی تھا ان کے دلوں میں جس کی سزا انہیں جاسوس بناکر اور جیلوں میں قید کرکے دی گئی۔ غرض "غدّار" مسلمانوں "پاکستان نواز" مسلمانوں اور پاکستانی چھاتہ بردار فوجیوں کے "مددگار" مسلمانوں کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ حکومت مغربی بنگال کی ایک اور ستم ظریفی یا حماقت یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں کی بیشتر تعداد کو علی پور اسپیشل

جیل میں بند کیا جہاں پہلے سے ایک پاکستانی ضبط شدہ جہاز کے عملے کے جہازی تارک وطن لوگ نظر بند رکھے گئے تھے۔ گویا علی پور اسپیشل جیل کے دشمن ملک کے اور جنگی قیدیوں کے نظر بندی کیمپ میں گورنمنٹ نے خود اپنے شہریوں کو بند کر دیا تھا اور اس طرح فرقہ پرست افسر شاہی نے اگرچہ اپنی دشمنی کی انتہا کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر یہ ظاہر کر دینا چاہا تھا کہ درحقیقت، وہ انھیں کیا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ملک کے جمہوری اور سیکولر دستور نے انہیں کاغذی شکل میں برابر کے حقوق دے رکھے ہیں۔ انہیں اس کی قطعی پروا نہ تھی کہ ہندستان کے باہر بھی جمہوریت اور سیکولرزم کے نام لیوا موجود ہیں ہندستان اور پاکستان کے علاوہ بھی ساری دنیا میں دوسرے مسلم ممالک کی آبادی ہے۔ جنہیں آزادی کے بعد سے ہمیشہ یہ یقین دلایا جاتا رہا ہے کہ ہندستان میں مسلمان بڑی عزت اور امن سے مساویانہ حقوق کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی تنظیم ہے بین الاقوامی قوانین ہیں۔ ہر ملک کی اقلیت کے ساتھ اکثریت کے برتاؤ پر خاص طور پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ یہ تمام لوگ، ملک، اور ادارے کیا سوچیں گے کہ ہندستان کی سیکولرزم، جمہوریت اور آپس کی بھائی چارگی کہاں گئی۔ اپنے ہی شہریوں کو دشمن ملک کے نظربندوں کی صف میں لا کھڑا کیا یہ کہاں کا قانون ہے۔ کیسا انصاف ہے۔ مسلم ممالک کیا سمجھیں گے کہ ہمیں جو کچھ بتایا جا رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ پاکستان اور بی بی سی لندن کے ذریعہ اطلاعات برابر پہنچ رہی ہیں کہ اب تک، فرقہ وارانہ فسادات، مسلمانوں

کے قتل و غارت کی لرزہ خیز اور خونریز داستانیں جو سننے میں آتی ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے۔ سید بدرالدجیٰ اور دوسرے لیڈر جو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں چلاتے ہیں وہ کہانتک حقیقت پر مبنی ہے۔ کیا فرینک انتھونی ایک عیسائی ممبر پارلیمنٹ کے اس بیان میں حقیقت ہے کہ ہندوستان خود ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔ جس میں مسلمان قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کا کیا ردِّ عمل ہوگا جو دنیا بھر میں بنیادی حقوق انسانی کے تحفظ کی مہم چلا رہی ہے؟

یہ سارے سوالات یقیناً ہر ذی ہوش، بیدار مغز اور غیر جانبدار سیاستداں کے ذہن میں ضرور اٹھتے لیکن یہاں تو اوپر سے لے کر نیچے تک، وزراء اور افسران اعلیٰ سے لے کر ایک معمولی چپراسی تک، ایک بڑی اکثریت صرف مسلمانوں کی دشمن تھی۔ ان کو ہر طرح نقصان پہنچانے کے درپے تھی اور چاہتی تھی کہ یہ سب کے سب ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ اس فرقہ پرست عنصر کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کر کے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دو۔ انہیں کوئی چارہ نہ رہے سوا اس کے کہ وہ یا تو اپنی دو نمبر شہری کی حیثیت پر صابر و شاکر ہو کر اپنے ضمیر اور روح کو کچل کر ہندوستان میں رہیں یا یہاں سے نکل جائیں۔ ان فرقہ پرستوں کو تو اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانا تھا ان کو اس سے کیا کہ ان کی اس پالیسی کا بین الاقوامی ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔

ابتدائی تیاریاں:- چنانچہ ہند و پاک جنگ شروع ہوتے ہی دوبے اور

اس کے ہم جلیسوں نے مسلمانان مغربی بنگال پر قیامت توڑنے کی ابتدائی تیاریاں شروع کر دیں۔ جتنے با اثر اور ذی اقتدار مسلمان تھے، جتنے پُرجوش اور منظم ورکر تھے، جتنے ایسے مسلمان کہیں بھی تھے جو مسلمانوں کی کس مپرسی میں ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو سکیں ان کی فہرست مرتّب کی گئی۔ ان کی شناخت کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے گئے۔ تاکہ بعد میں گرفتار کرنے میں آسانی ہو۔ پاسپورٹ کی انکوائری، راشن کارڈ کی انکوائری اور دوسری سرکاری مدوں میں تحقیقات کے بہانے ان کے گھروں کے پتے، ان کے موجود رہنے کے اوقات، ان کے گھر کے افراد کی تعداد یہ سب نوٹ کی گئی۔ لیکن یہ سب کچھ انتہائی رازداری اور سرعت سے کیا گیا یہاں تک کہ لال بازار پولیس ہیڈ کوارٹر کو بھی اس منصوبہ کی کوئی خبر ۸ ستمبر ۶۵ء کی نصف شب سے پہلے نہیں دی گئی کہ کہیں بات کھل نہ جائے کوئی پولیس والا اپنے دوست احباب کو بتا نہ دے۔ ایک، آدھ جو مسلمان پولیس آفیسر تھا اسے کہیں بھنک نہ مل جائے اور وہ فرقہ پرستوں کے بدنصیب شکاروں کو آگاہ نہ کر دے اور وہ جانے بوجھے ٹھکانوں سے ہٹ کر شکاریوں کے جال کو دھوکا نہ دے جائیں۔ ان بدبخت پنچھیوں کو پنجروں میں بند کرنا تھا اور ان کی گرفتاری میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ انتہائی خاموشی سے وزیر اعلیٰ پی سی سین کو اس امر پر راضی کیا گیا کہ وہ اپنے طور پر ملک کے تحفّظ کے نام پر بعض عناصر کی ڈیفنس آف انڈیا رولز ۳۰ کے تحت گرفتاری کی منظوری دے دیں اور گورنر مغربی بنگال مس پدمجا نائیڈو

سے بھی جن کے آرڈر پر یہ گرفتاریاں عمل میں آنا تھیں اس امر میں سیکوریٹی کے
کے اسباب کے تحت سفارش کر دیں۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ اس منصوبہ کو مسٹر اتلیہ
گھوش مغربی بنگال کے ڈکٹیٹر اور ہندستان کی حکمراں سنڈی کیٹ کے ایک ہمراہ
کی بھی حمایت حاصل تھی ۔ اس طرح دھوکہ دے کر پی سی سین سے اس آرڈر
پر دستخط کرالیے گئے۔ گورنر مغربی بنگال نے کمشنر کلکتہ پولیس پی۔ کے سین
اور کلکٹروں کو اختیارات دے دیئے کہ وہ ان کی نیابت میں ڈی آئی آر کے
مجوزہ نظر بندوں کی گرفتاری کے فارموں پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ یہ فارم
بھی ہزاروں کی تعداد میں دستخط کرواکر تیار کیے گئے اگرچہ ان پر نام نہیں
لکھے گئے اور ناموں کی فہرستیں احتیاطاً صیغۂ راز میں رکھی گئی تھیں اور اسطرح
۸ر ستمبر ۱۹۶۵ء کی اس منحوس رات کے خیر مقدم کی تیاریاں مکمل ہوگئیں جبکہ مسلمانان
کلکتہ پر قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ اور آخر وہ رات بھی آگئی جس کا ان ستم پیشہ
فرقہ پرستوں کو اس قدر بے صبری سے انتظار تھا اور جس کی تیاریاں اس
بے صبری کے بالکل برعکس انتہائی صبر اور رازداری کے ساتھ عمل میں آئی
تھیں۔ حتیٰ کہ مغربی بنگال کے اسٹیٹ ہوم منسٹر آر وندو شیکھر نسکر کو بھی اس
منصوبہ کی خبر نہیں تھی ورنہ ان کے الیکشنی علاقہ منگرا ہاٹ سے مولانا غلام علی
کبھی گرفتار نہ ہوتے جو ان کی اس علاقہ سے بار بار کامیابی کے ضامن تھے
اور انہیں ۱۹۶۵ء کے بعد ۱۹۶۷ء میں اسی علاقہ سے بری طرح شکست کھاکر بلیہ
گھاٹہ اسمبلی حلقہ میں پناہ لینا پڑی۔ اس سازش سے مرکزی ہوم منسٹر شری

گلزاری لال نندا بھی بے خبر نہ تھے۔

قیامت ٹوٹ پڑی

۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کی بھیانک رات بھیگ چکی ہے وقت آہستہ روی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ ہندستانی فوجیں یلغار کرتی ہوئی لاہور میں پنجاب (پاکستان) کے دارالحکومت سے چند میل دور رہ گئی ہیں۔ دو روز پہلے وزیراعظم لال بہادر شاستری پارلیمنٹ کی لابی میں لگے ہوئے ہندو پاک جنگی محاذ کے دیوار گیر نقشے کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کر چکے ہیں، کہ ڈنر شاید ہم لوگ لاہور میں کھائیں لیکن اچھوگل کنال پار کرنے کے بعد یکایک ہندستانی افواج کی پیش قدمی رک گئی۔ آج ۸ ستمبر کی رات کو بھی عوام ریڈیو سے کان لگائے تازہ ترین خبریں سننے کی ناکام کوشش کے بعد تھک ہار کر بستروں پر لیٹے ہیں۔ کلکتہ میں بلیک آؤٹ کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ اگرچہ مشرقی پاکستان کا محاذ نہیں کھلا ہے لیکن خطرہ ہے کہ عنقریب پاکستان کوئی ایسا اقدام نہ کر دے۔ لہٰذا سول ڈیفنس والے بڑی مستعدی سے سارے انتظامات کر رہے ہیں۔ ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے دیوار پر اکھڑی کی جا چکی ہیں۔ ریت کی بوریاں اپنی جگہ ہیں۔ فرسٹ ایڈ کے سامان ایر اٹینڈنٹروں اور وارڈن کی تحویل میں موجود ہے۔ اور سارے شہر میں ایک سنسنی، ہیجان، اور بحرانی کیفیت پائی جاتی ہے۔

ذہن کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں رات بڑی سیاہ ڈراونی اور ہولناک ہیں ایک شور مچاتا ہوا سناٹا جس میں کتوں کی آواز بھی شاذ و نادر ہی سنائی دیتی ہیں۔ سڑکیں

ویران دسنسان جاگ رہی ہیں۔ کلکتہ جو کبھی نہیں سوتا آج خلاف معمول ایک اعصابی اضمحلال کا شکار معلوم ہو رہا ہے۔ اکا دکا کار جیسے اپنی جسارت پر شرمندہ آہستہ سے گذر جاتی ہے۔ فضا پر ایک مبہم سی کشیدگی مسلط ہے جیسے کوئی بھیانک حادثہ ہو گیا ہے یا کوئی قیامت خیز سانحہ ہونے والا ہے۔

یکایک لال بازار پولیس ہیڈ کوارٹرس میں جمع سیکڑوں چھوٹے بڑے پولیس افسران کے پاس اسپیشل برانچ اور انٹلی جنس برانچ کے افسران پہنچتے ہیں۔ پولیس افسران کو صرف یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ایس بی اور آئی بی کے آدمیوں کے ساتھ جائیں اور گرفتاریوں میں ان کی مدد کریں۔ یہ آرڈر کہ انہیں کہاں جانا ہے اور کسے گرفتار کرنا ہے راستے میں دیئے جائیں گے۔ سیکڑوں آفیسر چونٹیوں کی طرح لال بازار ہیڈ کوارٹر سے کاروں پر روانہ ہو کر سارے شہر میں پھیل جاتے ہیں ان کی توجہ کا مرکز وہ مسلم آبادی کے علاقے ہیں جو مسلسل فسادات کی بنا پر بڑے بڑے پاکٹوں یا حلقوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ، کیلا بگان، چونا گلی، چیت پور روڈ، چاندنی، نیو مارکٹ، خضر پور واٹ گنج، مومن پور، مٹیا برج، ہوڑہ، ۲۴ پرگنہ، ویلسلی، مہدی بگان، راجہ بازار، نارکلڈانگہ، پھول بگان، توپسیا، جان نگر، تانتی باغ، پارک سرکس، بیگ بگان، شمس الہدیٰ روڈ، غرض ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

ہر مسلم علاقہ پر حملہ ہو چکا ہے۔ ہر محلے سے ایک بار پھر جمہوریت، سیکولرزم مساوات اور اخوت کا جنازہ نکلنے والا ہے۔ اس مرتبہ آگ اور خون کی ہولی نہیں کھیلی جارہی۔ اس بار مسلمانوں کی عزت و وقار پر حملہ کیا جارہا ہے۔ انہیں صرف جن سنگھ اور آر۔ایس۔ایس اور دوسرے فرقہ پرستوں کی طرف سے "غدار" اور "ہندستان دشمن" ہونے کا زبانی خطاب نہیں مل رہا ہے۔ اسے ثابت کیا جارہا ہے کہ ہم تمہیں بھی اپنا اتنا ہی بڑا دشمن سمجھتے ہیں جتنا ان پاکستانیوں کو جن سے ہم جنگ کر رہے ہیں۔ تم نے ملک کی بقاء و سلامتی کے لئے جو بھی قربانیاں دیں وہ ہماری نظروں میں خاک ہیں۔ ہم تمہیں اس وقت تک معاف نہیں کریں گے جب تک تمہارا وجود اس سرزمین پر باقی ہے۔ اور شاید اس کے بعد بھی نہیں۔

قوم پرست مسلمانوں کو خاص طور پر سزا زیادہ شدید ملی جنھوں نے پاکستان اور ہندستان کی تقسیم کے بعد پاکستان جانے والے اعزاء سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر ناتہ توڑ لیا تھا کہ تم نے نقل وطن کی تو تم ہمارے لئے مرگئے۔ ہم اپنی مادر وطن کو نہ چھوڑیں گے ہم نے یہیں جنم لیا ہے اور اسی مقدس مٹی تلے دفن ہو جائیں گے۔ دراصل ان کو تمام مسلمانوں کے ساتھ پسنا ہی تھا اس لئے کہ یہ سازش اس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جارہی تھی۔ اور کلکتہ کے مسلمانوں کے اقتصادی توڑ کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ چنانچہ فرقہ پرست اپنے اس منصوبے میں بڑی حد تک کامیاب رہے جن مسلمانوں کی نوکریاں تھیں اس بدنامی کے بعد انہیں نوکری

سے نکالدیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے ملازم پیشہ لوگوں کو تو چھوڑیئے بڑے بڑے آفیسر نکال دیے گئے مثلاً زین العابدین خاں جو مہندر اینڈ مہندر میں انجینئر کی بڑی نوکری پر فائز تھے۔ انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اور وہ بحران کا شکار ہو گئے۔ بڑے بڑے کاروباریوں اور دوسرے لوگوں کا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ بعض لوگ بددل ہو کر بالآخر ہندستان چھوڑ گئے مثلاً تاج محمد صاحب۔ غلام کبریا صاحب کے لڑکے غلام کریم صاحب بشیر داڑیا بعض نے گرفتاری اور ذلت کی زندگی سے موت کو بہتر سمجھا اور یہ دنیا ہی چھوڑ گئے۔ مثلاً ہاشم صاحب (چاندنی) سیٹھ یوسف۔ ادریا۔ حیدر، محمد رفیق، محمد یوسف فتح دین سلیمان درد، حکیم نثار احمد صاحب، عباس علی خاں بے خود صاحب، قاضی اقبال احمد، ابراہیم صاحب مسلم ویلفیر۔ کامریڈ ہاشم۔ تاج محمد پاکستان جا کر انتقال کر گئے۔ غرض ڈی آئی آر میں مسلمانوں کو پاکستان نواز بتا کر جیل بھیجنے سے فرقہ پرستوں کی دلی مراد پوری ہوئی۔ ایک طرف تو وہ اقتصادی اور معاشی طور پر چور ہو گئے دوسری طرف ذہنی طور پر ایک بار پھر غیر محفوظیت اور احساس کس مپرسی کا شکار ہو گئے۔

ان گرفتاریوں کی ذمہ داری بہر حال حکومت وقت تھی جو کانگریس پارٹی کے زیر اقتدار چل رہی تھی مرکز اور مغربی بنگال دونوں مقامات پر کانگریس ہی برسر اقتدار تھی اور مسلمانوں کا غم و غصہ اسی پارٹی کے خلاف تھا اور جائز تھا۔ ایسا ہوا کیونکہ فسطائی، امرتھا اور فرقہ پرست عناصر یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمان کانگریس

کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں جن کی ۸۰ فیصد آبادی تمام فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود ہر ایک الکشن میں کانگریس ہی حمایت کیا کرتی تھی اور جس سے کانگریس کو بڑا فائدہ پہنچا تھا۔ مغربی بنگال کے ۹۔ اضلاع میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور کم سے کم اسمبلی کی ۵۰ نشستوں پر ان کی مکمل اکثریت ہے۔ لہذا آج کی طرح اس دور میں بھی مغربی بنگال کی سیاست کا رخ مسلمان دوٹروں ہی کے رحم وکرم پر تھا۔

چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ڈی آر کی گرفتاریوں کے بعد جب ۱۹۶۷ء کے انتخابات سامنے آئے تو کانگریسی لیڈروں کو بھی اس امر کا یقین تھا کہ بغیر مسلمانوں کی حمایت کے الکشن جیتا نہیں جاسکتا۔ لیکن سارے مسلم با اثر لیڈران کم وبیش جیل سے ہو کر آئے تھے اور ان کے سینوں میں اپنی بے عزتی اور حب الوطنی پر شکوک کی بنا پر آگ بھری ہوئی تھی۔ لہذا بڑی تگ ودو کے بعد چند ایسے کانگریسی لیڈروں بجے سنگھ نہار، اشوک سین اور ایشور داس جالان وغیرہ نے جن کی ساکھ مسلمانوں میں قائم تھی اپنی کوششوں سے رائٹرس بلڈنگ میں ایک میٹنگ بھی بلائی۔ جو پی سی سین کے ایما پر منعقد کی گئی تھی اس میں احمد سعید ملیح آبادی، جناب قطب الدین (چاندنی)۔ منظور احمد صاحب (رائل انڈین ہوٹل) حاجی قیوم صاحب (امینیہ ہوٹل) اور چند دیگر صاحبان کے علاوہ میں بھی موجود تھا۔ اس میٹنگ میں پی سی سین اور دیگر کانگریسی لیڈروں نے مسلم نمائندوں سے یہ درخواست کی کہ وہ الکشن کے دوران مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت پر آمادہ کریں۔

میں نے اس وقت پی سی سین سے یہ کہا کہ ہم کس منھ سے مسلم عوام سے

الکشن میں کانگریس، کی حمایت، کی اپیل کر سکتے ہیں جبکہ ہم سب کو ملک دشمن اور پاکستان نواز سرگرمیوں، کے الزام میں جیل کے اندر ٹھونس دیا گیا تھا۔ اگر ہم عوام کے پاس کانگریس کی اپیل لے کر جائیں گے تو وہ ہمیں غدار نہ کہیں گے کہ ابھی تم جاسوسی کے الزام میں اسی کانگریس پارٹی کے ہاتھوں جیل کھٹ کر آئے ہو اور پھر اسی پارٹی کو ووٹ دینے کی ہم سے اپیل کر رہے ہو، تمہاری بے حیائی کی کوئی انتہا ہے، اس وقت ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔

اس پر پی سی سین نے جواب میں بتایا کہ آپ۔ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں۔ یہ گرفتاریاں مرکزی حکومت کے آرڈر پر ڈی۔ آئی۔ آر۔ رول ۳۰ کے تحت ہوئیں۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ یکایک یہ کارروائی ہو گئی اور ہمیں چھان بین کا موقعہ نہ دیا گیا۔ اچانک ہی سب کچھ ہو گیا۔ چونکہ آپ سب بے قصور تھے اس لئے آپ کو جلد ہی چھوڑ دیا گیا (واضح ہو کہ کچھ لوگوں کو ساڑھے چار پانچ ماہ بعد چھوڑا گیا) آپ کے دورِ حراست کے دن ایسے ہیں جیسے تھے ہی نہیں۔ آپ کے ریکارڈ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا اور آپ کا دامن اتنا ہی بے داغ ہے جیسے خود میرا۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا یہ سب کہنے کی باتیں تھیں، عوام فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور انہوں نے طے کیا تھا۔ ۶۷ء میں کانگریس کو ایک زبردست شکست ہوئی۔ اس طرح فرقہ پرست اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہو گئے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے نفرت ہو گئی۔ بائیں بازو کی پارٹیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن چونکہ یہ غیر متوقع تبدیلی ان کے منظم ہونے سے پہلے عمل میں آئی۔ اس لئے ۶۷ء میں کانگریس

کو مکمل طور پر شکست نہ ہوسکی اس کی تکمیل ۶۹ء کے انتخابات میں ہوگئی اور کانگریس مغربی بنگال سے ایسی گئی کہ اس کا اثر ابھی تک مغربی بنگال میں باقی ہے اور ۷۷ء کے انتخابات کے بعد تو غالباً کانگریس کے دوبارہ مغربی بنگال میں برسر اقتدار آنے کے امکانات انتہائی بعید ہیں۔ بہرحال یہ سارے نتائج تھے جو ۶۵ء کی گرفتاریوں کے بعد مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا ایک جزو بن چکے ہیں۔

گرفتاریاں

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا۔ لال بازار پولیس ہیڈ کوارٹر سے پولیس کی گاڑیاں نکل کر کلکتہ کے سارے مسلم علاقوں میں پھیل گئیں۔ سب تھانوں کو اطلاع دے دی گئی کہ ایک بہت بڑی مہم شروع ہونے والی ہے لہذا وہ اپنے اسٹاف کو مستعد رکھیں۔ رات بارہ بجے سے صبح ۵ بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔ گرفتاریاں بڑی شدومد سے ہوتی رہیں۔ با اثر اور لیڈر قسم کے لوگوں کو تو اس بہانے تھانہ لے جایا گیا کہ او سی نے انہیں طلب کیا ہے اور دوسرے لوگوں کو کھلم کھلا سنگینوں اور بندوقوں کی نوک پر تھانوں میں بھر دیا گیا۔ پولیس کے افسران سپاہیوں کے ساتھ جاتے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ کسی کو وہیں گرفتاری کا آرڈر دکھا دیا جاتا تھا اور کسی کو صرف افسر شاہی کے بل پر تھانے لایا جاتا تھا اور پھر اسی سے اس کے باپ کا نام اور پتہ پوچھ کر فارم پر خانہ پری کی جاتی تھی اور بٹھا دیا جاتا تھا۔ اکثر لوگوں کو کپڑا بدلنے اور بال بچوں سے ملنے کی بھی اجازت نہ دی جاتی تھی۔

رات کی تاریکی میں چھاپہ پر چھاپہ پڑ رہا تھا اور سینکڑوں افراد بے دست و پا بنا کر

تھانوں میں بھرے جارہے تھے. جہاں چھاپہ پڑتا تھا اگر ان کے پاس فون ہوتا تھا کہ وہ اعزا و احباب کو فون کرتے تھے کہ بال بچوں کی نگہداشت کے لئے ان سے کہہ جائیں تو عموماً یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ لوگ بھی اٹھائے جا چکے ہیں. میں ہرن باڑی لین سے گرفتار ہوا تو میں نے اپنے بڑے بھائیوں یعنی یوسف صاحب، رفیق صاحب، (فتح دین) کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔

سارے شہر میں ایک افراتفری اور خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ رات کی دبیز چادر بھی ان ظالموں کے ظلم و استبداد کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی، ان کا ستم اس قدر ہمہ گیر اور اعلانیہ تھا کہ فرعون اور ہلاکو کی ہلاکت آفرینی بھی مات تھی. لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح تھانوں میں ٹھونسا جا رہا تھا اور یہ تاناشاہی کے شکار، فرقہ پرستوں کے ہدف جور بے آب و دانہ اس اچانک حملہ پر متحیر اور ششدر بیٹھے تھے، سوچنے اور سمجھنے کی تمام قوتیں وقتی طور پر سلب ہو چکی تھیں، ایک شدید اور جانکاہ صدمہ تھا جو دماغ کو مفلوج کئے ہوئے تھا. بڑے بڑے با اثر لوگ، قومی کارکن اور سیاسی لیڈر جو چشم زدن میں ہر بحرانی مسئلے کا حل تلاش کر لیا کرتے تھے، اس ذاتی اور اجتماعی المیہ کا حل تلاش کرنے سے قاصر ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ کہ یہ کیا ہو گیا۔ اور غیر شعوری طور پر "مرگ انبوہ جشن دارد" کے مصداق منتظر تھے کہ دیکھئے اور کون کون اس جال میں پھنسا ہے اور کون نہیں آیا. اگرچہ فی الوقت صرف اپنے ہی علاقہ کے لوگوں کے متعلق سوچا جا سکتا تھا. مکمل نقشہ تو نظر بندی کیمپ میں جیل کے تار اور اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے اپنے پورے بھیانک امکانات کے ساتھ پیش نظر آنے والا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گذرتی رہی لوگ گرفتار ہوکر آتے رہے۔ گرفتاریوں کا یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہا، ہر تھانے کا پورا عملہ سینکڑوں فارموں پر نام اور پتے لکھنے میں مصروف تھا یا لوگوں کو گرفتار کر کے لا رہا تھا۔ ہزاروں ہزار ڈی آئی آر کے تحت گرفتاری کے فارم آفیسران بالا کے دستخطوں کے ساتھ موجود تھے صرف گرفتار ہونے کی دیر تھی اور آرڈر تیار۔ اس بہانے خوب خوب، دشمنیاں نکالی گئیں جو لوگ پولیس کے معاون بنے ہوئے تھے ان کی چاندی تھی دشمنوں اور مخالفین سے بدلے بھی لئے اور دونوں ہاتھوں سے بڑی بڑی رقمیں بھی بٹوریں، کچھ لوگوں کو اپنی ذاتی پرخاش کی بنا پر گرفتار کروایا اور اکثر کو اس لئے کہ آئندہ ان سے مزید مالی منفعت کی امید تھی جن لوگوں کے نام پولیس کی فہرست میں نہ آسکے تھے انہیں پولیس کے ان مسلمان انفارمروں نے یہ کہہ کر خوفزدہ کیا کہ وہ بھی گرفتار ہونے والے ہیں اگر وہ بھاری رقوم دیں تو ان کو گرفتار نہ کیا جائے گا اور گرفتار شدگان کے گھر والوں کو یقین دلایا کہ اگر انہیں بھاری رقوم دی گئیں تو ان کی جلد رہائی کا بندوبست کریں گے

یہ وہ لوگ تھے جنھیں لازمی طور پر گرفتار ہونا چاہیئے تھا لیکن انہیں پولیس نے ہاتھ نہ لگایا، ان کی تحریریں اور تقریریں ایسی تھیں کہ انھیں تو بہرحال گرفتار ہونا چاہیئے تھا ان میں کچھ لوگ خاص طور پر پاکستان نواز تحریروں اور تقریروں کے ذمہ دار تھے کچھ لوگ اعلانیہ محمد علی جناح کو اپنا قائد کہتے تھے۔ ان لوگوں کا آزاد گھومنا ایک کھلا ثبوت تھا اس بات کا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ جیل میں لوگوں نے ان آزاد لوگوں کے متعلق خوب خوب خیال آرائیاں کیں جو بہرحال حقیقت نظر آتی تھی، غالبًا پروفیسر

عباس علی خاں صاحب بیخود نے گرفتاری کے بعد علی پور جیل پہنچ کر اسی وجہ سے یہ فرمایا تھا کہ "خدا کی قسم وہی صحیح معنوں میں مسلمان ہیں جو اس وقت جیل میں بند ہیں۔" اور پھر اگر مسلم عوام اس بارے میں غور کریں تو انہیں یہ چہرے فوراً تصور میں نظر آجائیں گے جو ان صفات کے حامل ہیں اور انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ حضرت عباس علی خاں بیخود اور حکیم نثار احمد صاحب جیسے سیاست سے کبھی واسطہ نہ رکھنے والے لوگوں کے بجائے ان لوگوں کو گرفتار کیوں نہ کیا جو سیاست اور خصوصاً فرقہ پرستانہ مسلم سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھتے ہیں۔ جن کا گرفتار ہونا یقینی سمجھا جا سکتا تھا لیکن جو آزاد رہے۔ ان کے آزاد رہنے کے پس پردہ جواز تھا وہ فوراً ہی بر سر عام آگیا۔ لیکن مختلف مصلحتوں کی بنا پر عوام و خواص نے اسے برداشت کیا اور اب بھی برداشت کئے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جو اپنے بھائیوں کے خلاف پولس میں جھوٹی سچی رپورٹیں پہنچا کر یا تو سرخرو ہوتے ہیں یا پھر چند ٹکے پا جاتے ہیں ہمارے معاشرے کے ناسور ہیں لیکن ناگزیر اور لازمی پولس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے اور جب تک ضرورت ہے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے اور مسلم معاشرے میں غداروں کی کمی نہ رہے گی۔

خیر ذکر تو یہ اس قیامت کا ہے جو مسلمانوں پر ۸ ستمبر ۱۹۶۵ء جمعرات کی رات کو ٹوٹی اور جمعہ کو سارے شہر کی مسجدیں ویران ہو گئیں، ہر علاقہ میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محلے خالی ہو گئے اور لوگ اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب ان کے سربر آوردہ لوگوں کی غیر حاضری میں فرقہ پرست اپنا داؤں کریں گے۔ کلکتہ کے عوام کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کوئی نئی بات نہ تھے اور اب گھر گھر یہ اندیشہ تھا کہ کب فساد پھوٹتا ہے۔ زیادہ تر گرفتار

شدگان کو بھی یہ خدشہ تھا کہ ان کی گرفتاری کے بعد ان کے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ بہتوں کے وہاں اگر دولت گھر کی لونڈی تھی تو بہتوں کے گھر میں راشن کا پیسہ نہ تھا اگر اکثر گھروں میں کچھ اور لوگ بھی ماسوا گرفتار شدگان کے گھر بار کی نگہداشت کرنے والے موجود تھے تو بیشتر گھروں کے واحد کمانے والوں اور سر پرستوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو کاروباری تھے انہیں اپنے کاروبار کی فکر تھی جو نوکری پیشہ تھے انہیں نوکری جانے کا اندیشہ تھا۔ جو دولت مند تھے انہیں اپنے اعزا، واقارب اور بال بچوں کے تحفظ کی فکر تھی، جو غریب تھے انہیں اپنے گھروں میں فاقوں کی فکر تھی۔

غرض تھانوں میں بیٹھے مزید قیدیوں کی آمد کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے اس کا دھڑکتے ہوئے دلوں سے انتظار کرتے ہوئے لوگوں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی فکر اور کسی نہ کسی اندیشے کا شکار تھا۔ رات گذر رہی تھی اور گرفتاریاں جاری تھیں۔ یکایک تڑکا ہوا۔ آہستہ آہستہ اجالا ہونے لگا اور یکایک تھانوں کی منجمد فضا میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا، جمود ٹوٹ گیا۔ اونگھتے اور فکروں میں ڈوبے ہوئے قیدی چونکے اور ایک نئے اندیشے کے ساتھ تھانوں میں تازہ سرگرمیوں کو دیکھنے لگے دھڑادھڑ گاڑیاں آ کر لگ گئیں اور ہر تھانے سے قیدی سینکڑوں کی تعداد میں آرمڈ پولس اور پولس کے پستول بردار سپاہیوں کی نگرانی میں ان کالی گاڑیوں میں از سر نو ٹھونسے جانے لگے، حفاظت کا اس قدر خیال رکھا جا رہا تھا جیسے یہ کلکتہ کے پرامن باعزت، اور مقتدر شہری نہیں، کسی زبردست ڈاکوؤں کے گروہ کے افراد یا پھر کوئی خطرناک غیر ملک کے جاسوس ہیں، وہی پولس آفیسر جو ان میں سے بیشتر کو ان کے دفتروں

اور گھروں میں جب جاتے تھے یا جلسوں میں ان کے سامنے آتے تھے تو ادب سے پیش آتے تھے اور بعض سلیوٹ کرتے تھے آج انہیں عام مجرموں کی طرح گاڑیوں میں ہانک کر بند کر رہے تھے اور یہ گاڑیاں اپنی اپنی منزل یعنی جیلوں کی طرف رواں دواں تھیں۔ کچھ علی پور سنٹرل جیل گئیں کچھ کی منزل علی پور پریسیڈنسی جیل تھا، جہاں عارضی زیر سماعت مقدموں کے قیدی، یا بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے مختصر مدت کے قیدی یا پکے مجرم رکھے جاتے تھے۔ اسی جیل میں کلکتہ اور ۲۴ پرگنہ سے تیرہ سو ستاسی ۱۳۸۷ افراد کو لاکر ٹھونس دیا گیا جہاں کوئی میڈیکل امداد کا انتظام نہ تھا۔ جہاں کھانے اور رفع حاجت کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ تھا۔ جہاں صرف لمبے۔ لمبے قطار در قطار کمرے تھے جن کے چاروں طرف کانٹے دار اور اسکے بعد بلند دیواریں اور ان کے اندر کچھ لڑکے قیدی اور ایک ضبط شدہ پاکستانی جہاز کے عملے نظر بند تھے اور اب ان میں شامل کرنے کے لئے ہندستانی حکومت خود اپنے شہریوں کو اجتماعی طور پر غدار، وطن فروشی، جاسوسی اور دشمن نوازی کا کریہہ الزام لگا کر بند کر رہی تھی۔

راقم الحروف کے لئے یہ ایک جانکاہ اور حیران کن سانحہ تھا۔ میں سوشیل ورکر کی حیثیت سے اپنے بھائیوں کی خدمت اپنی بضاعت بھر کرتا تھا فلموں سے دلچسپی رکھتا تھا فلمی مضامین لکھتا تھا اور فلمی پرچے نکالنے کا شوق تھا۔ ۶۲ء؁ میں میری شادی ہوئی اور ۶۵ء؁ میں گرفتار ہوا۔ کیوں؟ کس سبب سے یہ سوچنے سے میرا ذہن قاصر تھا۔ سید بدرالدجیٰ صاحب گرفتار ہوئے۔ وہ گرفتار ہوتے رہتے تھے، شہاب لکھنوی کے لئے بھی یقیناً یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ملّا جان صاحب کی اگرچہ یہ پہلی گرفتاری تھی لیکن باعث حیرت نہ تھی۔ رئیس جعفری اور دوسرے لوگ جو پہلے بھی گرفتار ہو چکے تھے ان کے متعلق تو خیر کسی

نہ کسی انداز میں سوچا جا سکتا تھا کہ انہیں بہ سبب غدادوران کی پچھلی گرفتاریوں کے پیش نظر جال میں پھانس لیا گیا۔ لیکن بیشتر لوگ ایسے تھے جن کی گرفتاری کا کوئی جواز سامنے نہ آتا تھا اور انہیں میں میں بھی ایک فرد تھا۔ بہر حال جب پولیس آئی اور میں گرفتار ہوا تو میں نے ۵۷ لور چیت پور روڈ فون کیا کہ یوسف بھائی اور رفیق بھائی کو حالات بتا دوں لیکن معلوم ہوا کہ وہ لوگ مجھ سے پہلے گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ میں بغیر اہلیہ کو کوئی خبر کئے ہوئے پولیس کے ساتھ چلا گیا اور اب کالی گاڑی میں بیٹھا۔ علی پور اسپیشل جیل جا رہا تھا۔

علی پور اسپیشل جیل

علی پور اسپیشل جیل میں قیدیوں کی آمد صبح ۷ بجے سے شروع ہوئی اور قریب بارہ بجے دن تک جاری رہی۔ دو قیدیوں کی کھیپ کے لئے بار بار جیل کا بڑا پھاٹک کھلتا تھا گاڑیوں کی قطار باہر کھڑی ہوئی، ایک ایک گاڑی کے لوگ بیرونی پھاٹک سے اندر آتے تھے اس کے بعد پھاٹک بند کردیا جاتا تھا۔ بیرونی پھاٹک اور اندرونی پھاٹک کے مابین جیل کا دفتر تھا اور درمیان میں ایک خالی غلام گردش جس میں قیدیوں کو ایک قطار میں کھڑا کردیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں گرفتاری کے فارم ہوتے تھے جو انہیں پکڑا دیئے گئے تھے۔ دو بے جیلر یا ڈپٹی جیلر کے ساتھ اکڑتا ہوا آتا تھا اور لوگوں کی شناخت کرتا تھا۔ ایک ایک آدمی دفتر میں جاتا تھا۔ سوالات کا جواب دیتا تھا اور اسے اندرونی پھاٹک کے پاس کھڑا کردیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لے کر نقدی بٹن، انگوٹھی، پین وغیرہ ساری چیزیں جمع لے لی جاتی تھیں جب پوری قطار مکمل ہو جاتی تھی تو اندرونی پھاٹک کا پہرے دار اس پھاٹک کو کھولتا تھا اور ساری قطار جیل کے اندر داخل ہوجاتی تھی۔ لیکن ابھی صبر کے امتحان اور بھی تھے۔ ابھی اصل جیل

کی عمارت میں داخلہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی صرف کانٹے دار تاروں سے گھرے ہوئے ایک احاطے میں قیدی جمع ہوئے تھے ابھی ان سے اور سوالات کئے جانا تھے ان کا معمولی طبی معائنہ باقی تھا۔ ابھی ڈپٹی جیلر کی طرف سے قیدیوں کی بے عزتی ہونا تھی۔ ابھی جیل کے جمعدار اور سپاہیوں کی طرف سے قیدیوں پر ڈانٹ پھٹکار پڑنا تھی تاکہ انہیں اس کا احساس شدید تر ہو جائے کہ وہ اپنے ہی ملک کے جیل میں اپنے ہی وطن کی غداری کے جھوٹے اور ذلیل الزام میں قید کئے گئے ہیں اور ان مردودوں کو ان کی بے عزتی اور ہتک کے لئے خاص طور پر تصور کیا گیا ہے لہذا وہی کچھ ہو رہا تھا جو اوپر بیان کیا جا چکا۔

جیل کے تاروں والے میدان میں درجنوں مسلمان آچکے تھے اور سینکڑوں آرہے تھے لیکن اب ہم سب جیسے اپنی قسمت پر شاکر ہو چکے تھے سوا چند کے جواب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ انہیں کیوں گرفتار کیا گیا۔ بقیہ اب یہ دیکھنے میں مشغول تھے کہ کون آرہا ہے۔ جب کوئی گروپ داخل ہوتا تھا تو "آپ بھی آگئے"، کا ایک نعرہ چاروں طرف سے لگایا جاتا تھا اور لوگ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے آنے والوں کا استقبال کرتے تھے اور معانقہ کرتے تھے جیسے یہ لوگ جیل میں نہیں بلکہ کسی تقریب میں شرکت کے لئے آرہے ہوں اور آنے والوں کو بھی حیرت اور پھر اپنے ... رے جانے پہچانے چہروں کو دیکھ کر مسرت ہوتی تھی اور گرفتاری اور بے عزتی کا غم ایک حد تک ہلکا ہو جاتا تھا۔ دراصل جتنے بھی لوگ علی پور اسپیشل جیل میں اس وقت موجود تھے سب مظلوم اور بے گناہ تھے اور ان کے ضمیر کسی قسم کی آلائش سے قطعاً پاک تھے لہذا

انہیں جو غم تھا وہ بے عزتی کا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک انبوہ ہے بے گناہوں کا جو ایک ہی جال میں پھنسا ہوا ہے ایک ہی ظالم کے ظلم کا شکار ہے تو ان کی ہمت بندھی اور اپنا انفرادی صدمہ اجتماعی المیہ میں ضم ہو کر ایک احساس طرب پیدا کر گیا اور اس طرح ظالم کا یہ منصوبہ کہ مسلم اقلیت کو بے عزتی بے حرمتی، الزام اور قید و بند کے شکنجوں میں جکڑ کر بے بسی اور ہراساں کر دیا جائے گا ناکام ہو گیا اور مسلمان دوبارہ اپنی فطری جرأت و ہمت کے سہارے اپنی قسمت پر شاکر ہو کر حالات سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہونے لگے۔ جارج برنارڈ شا نے جو مسلمانوں کا مشاہدہ کیا وہ صحیح تھا کہ اسلام اور مسلمان فولاد کی طرح ہیں یہ جس قدر نیچے جائیں ایک حد پر پہنچ کر دوبارہ اتنا ہی اونچے اٹھتے ہیں چنانچہ علی پور اسپیشل جیل میں جمع مسلمان بھی صدمہ، استعجاب بے بسی اور افسوس کے دور سے گذر کر اب حالات سے مقابلہ کرنے کے موڈ میں داخل ہو رہے تھے۔ صرف غم و غصہ باقی تھا۔

اور اس غم و غصہ کی نمائندگی رفیق صاحب (رفیع دین) میرے بڑے بھائی نے کما حقہ کر دی وہ جب جیل کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوئے تو دوبے حسب دستور انہیں اور ان کے ساتھیوں کو شناخت کرنے آئے۔ رفیق بھائی کا غصہ آتش فشاں لاوے کی طرح ابل پڑا۔ ایک انتہائی خلیق اور مہذب انسان تھوڑی دیر کے لئے شعلۂ جوالا بنا گیا۔ دوبے کو اس قدر غلیظ الفاظ میں گالیاں دیں جو ہم نے عمر بھر میں کبھی ان کے منہ سے نہ سنیں تھیں اور اسے وارننگ دے دی کہ ابھی اس کا جو جی چاہے کرے لیکن رہائی کے بعد وہ اسے نہ چھوڑیں گے۔ دوبے نے احتجاج کیا کہ وہ ایک پولیس افسر کو گالیاں دے

رہے ہیں، اس کا نتیجہ بہت خراب ہو گا۔ رفیق بھائی نے اس کا جواب دیا کہ اور نتیجہ کیا خراب ہو گا۔ جیل میں تو آ ہی گئے ہیں ان کی قوم کا ساکھ اور ان کی اپنی عزت تو ختم ہو ہی چکی ہے اب صرف ایک چیز باقی ہے وہ ہے پھانسی اور اگر رہائی کے بعد وہ اس کے کیریر کو ختم نہ کر سکے تو لات مار کر پھانسی پانے کو تیار ہیں۔ دوبے نے پھر احتجاج کیا کہ جیلر صاحب دیکھیئے یہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ رفیق بھائی نے کہا ہاں تو پھر کیا ہوا جو کر سکو کر لو۔ اور اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ رہائی کے بعد انہوں نے کمشنر اور دوسرے افسران بالا سے شکایت کی چونکہ اس وقت تک دوبے کے ہتھکنڈوں کی رپورٹ ان کو مل چکی تھی اس کی فرقہ پرستی کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا اور حکومت مغربی بنگال اور مرکز کو اپنی حماقت کا احساس ہو چکا تھا لہٰذا دوبے کو قربانی کا بکرا بنایا گیا اور اسے بارک پور ٹرانسفر کر دیا گیا اس طرح اس مردود کو کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔

مسلم دشمنی اور غداری کا دور دورہ تو ویسے نیچے سے اوپر تک تھا۔ اب جب کہ ہم کو آزادیٔ تحریر و تقدیر حاصل ہے۔ یہ انکشاف کیا جا سکتا ہے کہ مرکزی حکومت تک سے گرفتار شدگان کی رہائی کی کوشش کی گئی جب یہ معلوم ہوا کہ مرکز کے حکم سے یہ گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں تو گرفتار شدگان کے اعزا، و اقارب دہلی دوڑے کہ وہاں سے کوشش کی جائے۔ وہاں مرکزی وزیر داخلہ گلزاری لال نندا تھے ان سے ملاقات انتہائی دشوار تھی، لیکن کچھ لوگوں نے وسیلہ نکال کر ان سے ملاقات کر ہی لی، چنانچہ انھیں میرے بھائی ایوب بھی تھے جو اس وقت آزاد تھے۔ نندا جی نے بڑی سفارشوں کے

بعد فون پر پی سی سین سے رابطہ قائم کیا اور فتح دین کی پرانی فرم کے پارٹنرز کی گرفتاری پر اظہار حیرت کیا اور سفارش کی کہ انہیں چھوڑ دیا جائے تو خود پی سی سین نے فون پر انہیں بتایا کہ ان کے پاس فائل پڑے ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ انتہائی خطرناک ہیں۔ یہ دورنگی پالیسی تھی مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ کی نیچے والوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔

جیل کا بیرونی احاطہ بہر حال اب بھرتا جا رہا تھا۔ دن چڑھ آیا تھا اور اگرچہ ستمبر کا مہینہ تھا لیکن دھوپ اس روز بڑی تیز تھی یا پھر مصیبت زدگان کو کچھ تیز معلوم ہو رہی تھی۔ سات بجے صبح سے لوگ آنا شروع ہوئے تھے اور تانتا اب تک بندھا ہوا تھا کہ رات بارہ بجے سے اب تک جبکہ قریب قریب دس گھنٹے جاگتے ہوئے اور بغیر کھائے پیئے گذر گئے ہیں تو تم کو کچھ چاہیے کچھ کھاؤ گے کچھ ناشتہ کرو گے۔ شروع شروع میں تو کسی کو کھانے پینے کا ہوش نہ تھا البتہ جسے سگریٹ کی عادت تھی اور پاس تھا وہ پھونک ضرور رہا تھا لیکن جیل میں سگریٹ ماچس بھی جمع کر لئے گئے تھے ہر چیز لے لی گئی تھی۔ حالانکہ بعد میں ہر چیز کی اجازت مل گئی تھی لیکن اس وقت تو گورنمنٹ کے کارندوں کو اپنا رعب دکھانا تھا اور گرفتار شدگان پر یہ ثابت کرنا تھا کہ تم مکمل طور پر ہمارے رحم وکرم پر ہو۔ چنانچہ لوگ بیرونی احاطے میں بڑی شدت سے بور ہو رہے تھے، بھوک پیاس بھی اب ستانے لگی تھی لیکن ابھی تک صبر کا امتحان ۲ بجے دن تک طویل ہونا تھا۔ ابھی تک معائنہ کرنے والے ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے تھے۔ ڈپٹی جیلر ایک انتہائی بدذات قسم کا انسان قیدیوں سے سوالات کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی طرف سے کچھ ریمارک بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس کا رویہ انتہائی ہتک آمیز اور اہانت کی حد تک درشت تھا، خصوصاً جو بزرگ، اور عمر

قسم کے لوگ تھے وہ اس کی بدزبانی کا شکار زیادہ ہو رہے تھے۔ قیدیوں میں جو لوگ نوجوان نسبتاً کم عمر تھے ان کا غم و غصہ اس ڈپٹی جیلر کے خلاف بڑھتا جا رہا تھا۔ اور یہ یقینی امر تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی دھماکہ ہونے والا ہے۔

چنانچہ تھوڑے عرصہ بعد ہی یہ واقعہ ہو گیا اور حاجی تنویر احمد صاحب سے خاص طور پر انتہائی ہتک آمیز رویہ سے ڈپٹی جیلر کا پیش آنے سے آگ پر تیل کا کام کیا اور میں شہاب مکھنوی، رئیس احمد جعفری اور دوسرے لوگوں نے زبردست احتجاج کیا۔ ایک پر شور ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور قریب تھا کہ ڈپٹی جیلر صاحب کی تاج پوشی ہو جائے کہ اتنے میں جیلر جو ایک شریف اور خوش اخلاق خدا ترس قسم کا انسان تھا۔ ڈاکٹر کو لے کر وہاں آگیا اور فوراً ہی معاملے کو سمجھ کر معذرت کرنے لگا لیکن اب قیدی صرف معذرت سے ماننے والے نہ تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس ڈپٹی جیلر کو فوراً وہاں سے ٹرانسفر کر دیا جائے۔ جیلر نے اس وقت ٹرانسفر کرنے سے معذوری کی ظاہر کی اس لئے کہ کام بہت تھا لیکن یہ وعدہ کیا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر گھوش سے کہہ کر اس ڈپٹی جیلر کو ٹرانسفر کرا دے گا۔ اور آخر کار دوسرے یا تیسرے روز ایسا ہی ہوا اور اس ڈپٹی جیلر کا ٹرانسفر علی پور اسپیشل جیل سے ہو گیا یہ جیل میں پہنچنے کے بعد مسلمانوں کی پہلی فتح تھی افسر شاہی کے خلاف۔

جب ڈاکٹر آیا اور معائنہ ہونے لگا تو لوگوں نے جیلر سے احتجاج کیا کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں اور ان لوگوں کو قریب گیارہ بارہ گھنٹے جاگتے ہوئے اور بھوکے پیاسے ہو گئے ہیں جیلر نے معذوری ظاہر کی کہ اس کا جیل اتنے آدمیوں کی سمائی کے لئے نہیں تھا اور نہ پہلے سے اسے کوئی اطلاع تھی وہ کوشش کر رہا ہے کہ ان ڈیڑھ ہزار کے قریب آدمیوں کے لئے کھانے

کا بندوبست کرے۔ قیدیوں میں کچھ لوگ بیمار بھی تھے۔ ان کی دوا کا بھی کوئی انتظام نہ تھا کسی کو اسٹریچر پر بھی لایا گیا تھا۔ حاجی تنویر احمد صاحب جیسے کئی بوڑھے ناتواں انسان ان گرفتار شدگان میں تھے لیکن سب بھوکے بیٹھے تھے۔ پانی بمبے میں چل رہا تھا۔ خالی پیٹ کی آگ کو اس سے بجھانے کی کوشش کی جاتی تھی جو بہر حال ناکام ہوتی تھی

ڈاکٹر معائنہ کر کے قیدیوں کو الگ کھڑا کر رہا تھا اور جب ایک ٹولی تیار ہو جاتی تھی تو اسے تاروں کے پیچھے اصل جیل کے کمپاؤنڈ میں ہانک دیا جاتا تھا۔ جہاں کچھ سزا یافتہ قیدی ان کو گرفتاروں کو مختلف باتیں بتانے کے لئے موجود تھے۔ انہیں ایک تھالی، ایک باٹی اور ایک کمبل ملنا تھا جس میں انھیں زندگی بسر کرنا تھی۔ یہ قیدی جب اندر پہنچے تو انہیں تھالیوں باٹیوں (کٹوروں) اور کمبلوں کے ڈھیر دکھائے گئے کہ ان میں سے ایک ایک وہ لے لیں۔ قیدی ان اشیا پر ٹوٹ پڑے کہ بہتر سے بہتر چن لیں معلوم ہوا اکثر تھالیوں اور باٹیوں میں سوراخ تھے اسلئے وہ ناقابل استعمال تھیں، کمبل میں زیادہ تر کیڑے مکوڑے، جوئیں اور پسو تھے۔ ان میں بھی بیشتر پھٹے ہوئے تھے اور ایسے تھے کہ جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے وہ شاید نوکر چاکر کو یا کسی فقیر کو بھی یہ کمبل خیرات کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے لیکن اس وقت چونکہ راتوں کو خنکی ہونے لگی تھی اس لئے یہ عالم تھا کہ ایک کمبل اگر نسبتاً اچھا ہے تو اس کا ایک سرا ایک کروڑ پتی مسلمان کے ہاتھ میں ہے تو دوسرا ایک بیڑی والے کے ہاتھ میں اور جنگ ہو رہی ہے اس پر قبضہ کرنے کے لئے یہاں تک کہ بعض حالات میں تو کمبل داغ مفارقت دے جاتا تھا اور آدھا پھٹ کے ایک کے ہاتھ میں اور آدھا دوسرے کے ہاتھ میں۔

جیل کی چہار دیواری میں عموماً ایک منزلہ کمرے تھے صرف ایک عمارت دو منزلہ تھی
جس میں بڑے بڑے ہال تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو ایک آدمی کے ڈباؤ
سے بھی کم تھا۔ ایک ڈسپنسری اور ہسپتال تھا جو بس نام ہی کا ہسپتال تھا دو چارپائیاں
تھیں اور بس۔ کانٹے دار تاروں کے پاس کچھ ٹین کے شیڈ بھی تھے لیکن پختہ کمرے اتنے تھے
کہ سوا تھوڑے سے لوگوں کے باقی سب انہیں میں سما گئے۔ کچھ لوگوں نے دو منزلہ عمارت اسلئے
رہائش کے لئے منتخب کی تھی کہ وہاں سے جیل کی دیوار کے اوپر سے باہر کا منظر سامنے آتا
تھا دو ایک روز تو یہ سہولت رہی پھر اس میں کیلیں ٹھونک دی گئیں کہ قیدیوں کی نظر بھی
آزاد نہ رہے۔ نیچے کے کمروں میں سب سے پہلے پاکستانی نظربند جہازیوں کا کمرہ تھا اسکے
بعد کمروں کی ایک قطار چلی گئی تھی بغل میں دو منزلہ عمارتیں تھیں اور درمیان میں ایک میدان
جس میں قیدیوں نے نماز باجماعت شروع کی اور ان لوگوں نے بھی نماز باقاعدہ پڑھنا
شروع کردی جنہوں نے اس سے پہلے شاید جمعہ جمعہ ہی مسجد جانا گوارہ کیا ہوگا۔

تالاب ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا اسلئے کہ اس میں نہانے کی آسانیاں تھیں اور
کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے تھے۔ کیونکہ بعد میں گھروں سے اپنے کپڑا منگوانے کی اجازت بھی
مل گئی تھی۔ اسی طرح اور بھی سہولتیں ہم لوگوں نے جدوجہد کر کے اور افسران سے لڑ کر
حاصل کیں اور جیل خانہ جیل خانہ نہ رہا لیکن فی الحال تو بدترین کال کوٹھری معلوم ہو رہا تھا
رفع حاجت کے لئے جو قدمچے بنے ہوئے تھے وہ انتہائی بے حیائی کے مظہر تھے اور ایک
قدمچے پر بیٹھا ہوا انسان، دوسرے کو بالکل ننگا دیکھ سکتا تھا۔ ان پاخانوں میں ستر پوشی
کی گنجائش ہی نہیں تھی اور نہ کمروں کے اندر جو پاخانے تھے ان میں رفع حاجت کی جائے

تو سارے کمرے میں بو بھر جاتی تھی لہذا رفع حاجت کا مسئلہ ہمیشہ جب تک جیل میں رہے ایک ناقابل حل دشواری بنا رہا اور لوگوں کو اس سے بہت تکلیف ہوئی۔

دوپہر کا سورج سر پہ آچکا تھا اور اب ڈھل رہا تھا۔ صبح سے کسی قیدی نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور ابھی تک کھانے وغیرہ کی کوئی امید نہیں تھی۔ جب بھی جیلر سے پوچھا جاتا تھا وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ انتظام ہو رہا ہے۔ اتنے آدمی اچانک آگئے ہیں۔ ذرا دیر ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں مزاجوں میں برہمی پیدا ہونا یقینی اور فطری امر تھا ایک تو سب بھوکے تھے پھر کسی کو طلب کی چیز مثلاً پان سگریٹ بھی میسر نہ تھا۔ لہذا اب بے چینی صاف دیکھی جارہی تھی۔ اگرچہ فی الحال لوگ بستر وغیرہ لگانے یعنی کمبل سے جگہ پر قبضہ کرنے اور اپنے کمروں کے لوگوں سے بات چیت میں مشغول تھے۔

بدرالدجیٰ صاحب (ایم پی) کو پہلا کمرہ دیا گیا تھا جہاں اتفاق سے بغل میں پاکستانی جہازی تھے بدرالدجیٰ کے ساتھ کونسلر ابوحنیفہ محمد اسمٰعیل، قطب الدین (چینی) چاندنی۔ ڈاکٹر حلیم ماچس والے اور خضر پور کے سلیمان صاحب مہر تھے۔ اس کے بعد اور کمرے بھی اسی قطار میں گراؤنڈ فلور پر واقع تھے جو دراصل بڑے بڑے ہال تھے اور ان میں سے ہر ایک میں ساٹھ ستر افراد کی گنجائش تھی بغل میں ایک طرف تالاب تھا اور دوسری طرف ایک لمبا میدان اور پھر دو منزلہ عمارت اسمیں بھی بڑے بڑے ہال تھے اور اس کے بغل میں ایک اور دو منزلہ عمارت تھی اس کا بھی نقشہ وہی تھا۔ دو منزلہ پر میں میرے بھائی تاج محمد صاحب۔ قاضی الماس خان صاحب عنایت الرحمٰن صاحب۔ نواب مشرف حسین کے داماد غلام کبریا صاحب، رئیس جعفری صاحب، ابوبکر صاحب وغیرہ قریب

ڈیڑھ سو افراد تھے۔ یوسف صاحب (آزاد بوٹ ہاؤس) عمر صاحب سفر علی ابراہیم صاحب (مسلم ویلفیر) رزاق صاحب وکیل، اشتیاق حسین وکیل وغیرہ بھی یہیں تھے۔ نیچے کی منزل میں خضر پور اور مٹیا برج سے ابوالکلام (ساج گھر) صاحب اور دوسرے افراد ناظم علی مرزا وغیرہ تھے۔ (ان لوگوں کی مکمل فہرست دینا تو اب قریب قریب ناممکن ہے پھر بھی انہیں اوراق میں بیشتر نام کسی نہ کسی طور پر بہر حال آجائیں گے۔

میدان کے بغل کے دو منزلہ پر حاجی غلام رسول صاحب، حاجی عبدالقیوم صاحب، امین صاحب اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ بدرالدجیٰ صاحب جس درمیان کی عمارت میں تھے اس کی دوسری منزل پر مولانا غلام علی (مگراہاٹ) حاجی جے نگر، قاضی موسیٰ وغیرہ ۲۴ پرگنہ کے گرفتار شدہ مسلمان تھے۔ درمیانی عمارت کی نچلی منزل پر۔ بغل کے کمروں میں شہر یار بیگ صاحب، محمد ادریس صاحب فرنیچر والے، حاجی تنویر صاحب، ڈاکٹر رحیم صاحب ڈاکٹر رفیق صاحب، شہاب لکھنوی، اقبال اعظمی، شیخ اکبر علی صاحب (رپن اسکوائر) رفیع القدر کابل کونسلر، شمس الضحیٰ صاحب کونسلر، عباس علی خاں صاحب بیخود، حکیم نثار احمد صاحب، ڈاکٹر ظفر سرکار صاحب، زین العابدین صاحب انجینئر، اکرم صاحب (جان نگر) خواجہ محمد یوسف صاحب (ایڈوکیٹ) روبی ای حیدر صاحب، محمد یوسف صاحب (اسسٹنٹ کمشنر ریٹائرڈ) عبدالخالق صاحب اور غفار صاحب (جی آزلو ہنڈرڈ انپورٹ) شوکت پنجابی (پھول بگان) بشیر واڈیا صاحب، ہاشم صاحب (چاندنی) سیٹھ یوسف صاحب، عبدالباری صاحب، رحیم صاحب (جان نگر) حسن صاحب امجدیہ، مطیع الرحمٰن صاحب (ساگر دت لین) عبدالستار صاحب (چونا گلی) غرض اس قدر افراد تھے کہ پورے ڈیڑھ ہزار کے قریب

افراد کی مکمل فہرست دینا ناممکن ہے۔ نہ اس کی گنجائش ہے۔ جن افراد کے نام دیئے جا رہے ہیں ان سے کچھ نہ کچھ واقعات اور یادیں وابستہ ہیں اسلئے یاد رہ گئے۔ ان واقعات کا ذکر رفتہ رفتہ انہیں صفحات میں آئے گا۔

فی الحال تو لوگ یا موجودہ حالات پر جھلا رہے تھے یا پھر اس سانحہ پر اب تک غور کر رہے تھے۔ حکیم نثار احمد صاحب اپنے کمرے کے سامنے کے برآمدے میں بیٹھے صرف آسمان کی طرف تک رہے تھے اور بار بار یہ جملہ دہرا رہے تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ قاضی الماس خاں صاحب بھی نیچے چبوترے پر بیٹھے خاموش کچھ سوچ رہے تھے۔ غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی ڈیفنس فنڈ میں ایک لاکھ روپے دیئے۔ اس سے پہلے جواہر لال نہرو کا فنکشن جو کلکتہ میدان میں ہوا اس کا پورا خرچ اٹھایا۔ پھر اتولیہ گھوش نے انہیں کلکتہ کارپوریشن کا آلڈرمین نامزد کیا۔ پھر یہ گرفتاری کیسی۔ کس قصور کی سزا ہے۔ انہیں اس وقت کون بتاتا کہ مسلمان ہونا بجائے خود ایک گناہ ہے۔ فرقہ پرستوں کے نزدیک۔۔ اور پھر ایسا مسلمان ہونا جو متمول بھی ہو اور دبا ہوا بھی رہتا ہو۔ یہ تو بدتر از گناہ ہے۔ شہریار بیگ صاحب کو حیرت ہوئی کہ شری بجے سنگھ نہار کے وزیر محنت ہوتے ہوئے وہ کیسے جیل میں بند ہو گئے۔ انہیں کیا خبر کہ بجے بابو بے چارے کو تو اس کی خبر بھی نہ تھی سب کچھ بالا بالا ہی ہو گیا ورنہ وہ اپنے داہنے بازو کو بھلا جیل بھیجتے۔ یہ سب کچھ تو اچانک ہو گیا اور گرفتاری کے فیصلے صرف اس بنیاد پر کئے گئے کہ کس مسلمان کے خلاف ایس بی نے کیا زہر اگلا ہے اور وہ کتنا بااثر ہے اور حالات نازک ہونے پر وہ مسلمانوں کے کسی کام آ سکتا ہے یا نہیں۔ حاجی تنویر احمد صاحب ایک معمر اور بیمار انسان سوچ رہے ہونگے کہ انہیں کیوں لایا گیا کیا صرف اس قصور پر کہ انہوں نے ڈاکٹر بی سی رائے کے الکشن میں اپنے

مکان پر ان کا الکشن آفس کھول دیا تھا۔ اس طرح دیگر لوگ بھی حیران تھے مثلاً ہاشم صاحب اور رضی صاحب چاندنی۔ یہ باپ بیٹے ہمیشہ کانگریس کے زبردست حمایتی رہے اور دامے درمے قدمے سخنے ہر امداد پر تیار رہے۔ پھر یہ گرفتاری کیوں؟ سیٹھ یوسف صاحب کانگریس کے بڑے لیڈر نریش ناتھ مکرجی کے یار غار اور کانگریس کے پھول بگان میں زبردست حمایتی۔ ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ کیوں؟ لیکن اس "کیوں" کا جواب دینے والا دوبے اپنی کامیابی کے نشے میں چور ڈیڑھ ہزار انسانوں کو جیل کی دیواروں کے پیچھے بھیج کر خوش تھا اور ترقی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے مسلمان انفارمر اپنی جیبیں گرم ہونے اور آئندہ مزید آمدنی کے خوش آئند تصور سے مگن تھے اور رات کی تاریکی میں گرفتار ہونے والے مظلوم دن کے تین بجے بھی بھوکے تھے اور اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ کانٹے دار تار کو ہلا ہلا کر مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ کچھ کرو۔ شہاب لکھنوی اور رئیس جعفری اور دیگر لوگ زبردست احتجاج کر رہے تھے

یکا یک جیل کا اندرونی پھاٹک کھلا اور جیلر اندر تشریف لائے۔ انہوں نے قیدیوں کو بتایا کہ ان کے لئے فی الحال ناشتے کا انتظام کیا گیا ہے اور چنا اور مٹر ناشتے میں ملے گا لہٰذا وہ قطار در قطار کھڑے ہو جائیں۔ ساڑھے پانچ بجے انہیں کھانا ملے گا اور چھ بجے تالہ بند کر دیا جائے گا جبکہ وہ رات بھر کے لئے اپنے اپنے کمروں میں محدود ہو کر رہ جائیںگے بڑے بڑے دولت مند، ڈاکٹر، وکیل کونسلر، پروفیسر، شاعر، صحافی، سیاسی لیڈر، مذہبی پیشوا، کنٹراکٹر، تاجر، بزنس مین، کاروباری، غریب، امیر، بوڑھے، جوان، بیمار، صحت مند وہ لوگ جنہوں نے کسی فقیر کو بھی چنا یا مٹر نہ پیش کیا ہوگا، جن کے نوکر چاکر بھی بہترین

کھانا کھاتے ہیں، جو غریب فاقے کرتے ہیں تب بھی یہ خوراک نہیں کھاتے وہ سب کے سب اپنی اپنی باٹی اور تھالی لے کر اس طرح دوڑ پڑے جیسے جنت سے کوئی نعمت غیر مترقبہ ان کے لئے آتاری گئی ہو۔ اور جیل کے اہل کاران میں سے ہر ایک کو ایک ایک مٹھی ابلے ہوئے چنے یا مٹر بانٹنے لگے۔ یہ لوگ اس قدر بھوکے تھے کہ اسی کو لے کر انتہائی صبر و شکر کے ساتھ اپنے پیٹ میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے لگے۔

یہاں ایک بات صاف کر دینا ضروری ہے۔ سرکار کا قانون ہے کہ جو بھی شخص سیاسی نظر بند ہوگا اس کے خورد نوش اور رہن سہن، لباس اور بستر کا فوراً بندوبست کیا جائے گا اور اس کے لواحقین کو تا مدت نظر بندی اس کے اپنے معیار کے مطابق گذارہ ماہوار دیا جائے گا۔ چنانچہ برطانوی دور میں بھی سیاسی نظر بندوں کو جیلوں میں ذہنی طور پر جو بھی اذیت دی جاتی ہو لیکن جسمانی طور پر ان کے ہر طرح کے آرام کا خیال رکھا جاتا تھا آزادی کے بعد بھی بی ڈی ایکٹ میں متعدد مسلم لیڈر نظر بند ہوئے لیکن انہیں ہر قسم کی آسائش جیلوں میں حتی الامکان مہیا کی گئی۔ اور ان کے گھر میں ماہوار رقم بھی سرکار سے دی جاتی رہی۔ یہ پہلی بار ۶۵ئہ میں مسلمانوں کی گرفتاری کے بعد قانون کی کھلی خلاف ورزی کی گئی۔ نظر بندوں کے گھروں میں قید کے دوران یا اسکے بعد کوئی معاوضہ کی رقم نہ دی گئی۔ قید کے دوران جیلوں میں کوئی انتظام ان کے کھانے یا رہنے کا نہ کیا گیا۔ اور بعد میں جو ان کو سہولت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانا منگوا سکتے ہیں وہ بھی اندر قیدیوں کے احتجاج اور باہر ان کی عورتوں کے دھرنے اور بھوک ہڑتال کا نتیجہ تھا جس کا ذکر تفصیل سے بعد میں آئے گا۔ اس تصنیف کا

اصل مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ کانگریس برسر اقتدار نہیں اور پریس کو آزادی تحریر میسّر ہے تو یہ بتایا جائے کہ کس کس طرح ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں پر ظلم کیا گیا۔ قانون کی کس طرح انتہائی دیدہ دلیری سے خلاف ورزی کی گئی حتیٰ کہ قیدیوں کو جو بنیادی سہولتیں اور حقوق جیل اور نظر بندی کے قوانین کے تحت ملنا چاہیے تھیں وہ ان سے بھی محروم رکھے گئے۔ یہ کیسا انتظام تھا۔ یہ کون سے قصور کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔ یہ اب تک نہ معلوم ہو سکا۔

بہر حال مسلمانوں کو ناشتہ مل گیا۔ گرفتاری کے بعد ان لوگوں کو بھی خدا یاد آیا جو کبھی کبھار جمعہ کی نماز پڑھ لیتے تھے اور بعد کے قیدیوں نے دو عمارتوں کے درمیانی میدان میں ظہر کی نماز پڑھی تھی اور اس شان سے کہ معلوم ہوتا تھا کہ عید کا اجتماع ہے۔ اب مچھوا مسجد کے حاجی عمر صاحب نے عصر کی اذان دی اور محمد عربی کے غلام اللہ کے بندے اس کے حضور میں عبادت کے لئے صف بستہ ہو گئے۔ پیٹ کی آگ دھیمی ہو گئی تھی اور اس رزاق و رحیم کا جذبۂ تشکر خشوع خضوع سے عود کر آیا تھا جس نے چنے اور مٹر کی خوراک ہم تک پہنچائی تھی۔ عصر کی نماز کے بعد ہی کھانے کی گھنٹی بج گئی اب ہمیں صرف نصف گھنٹے کی مہلت تھی کہ اس دوران قطار میں کھڑے ہو کر کھانا لیں، اسے کھائیں، پانی پئیں اور رات کے لئے پانی کا انتظام کریں پھر رفع حاجت کر کے اپنے اپنے کمروں میں بند ہو کر صبح کا انتظار کریں۔

گھنٹی بجتے ہی قیدیوں نے جو کھانا پکانے پر مامور تھے۔ پتیلے لاکر رکھ دیئے جن پر اس قدر میل جما ہوا تھا کہ دیکھ کر جی متلا تا تھا۔ کالے کالے گندے برتن۔ مسلمان قطار میں کھڑے تھے اور حیرت اور کراہت کے ملے جلے جذبات سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ کھانے کو کیا تھا۔ پانی ایسی دال، چاول جنمیں برابر کے کنکر بھرے ہوئے تھے۔ دانت لگتے ہی سارا بدن لرز جاتا تھا۔

روٹیاں جن کے آٹے میں اتنی ہی ریت ملی ہوئی تھی کہ وہ کسی طرح صرف نگلی جا سکتی تھی۔ چبانا ممکن تھا۔ بھاجی جس میں سڑے ہوئے کالے بیگن، کدو، کہیں سڑے ہوئے آلو، اور نہ معلوم کیا کیا بلا خور بھرا ہوا تھا۔ اور آخر میں املی کی پتلی پانی کی طرح کی چٹنی۔ یہ تھا ان قیدیوں کا پہلا کھانا جسے کھا کر انہیں پوری رات بتانا تھا۔ واضح رہے کہ ان میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے کہ اگر کسی جرم کے سلسلے میں بھی انہیں سزائے قید ہوتی تو انہیں ان کے معیار کے مطابق از خود جیل کا قانون فرسٹ ڈویژن قیدی گردانتا اور انہیں گوشت، انڈا، ڈبل روٹی اور چائے تو ضرور ہی ملتی۔ یہاں معاملہ ہی الٹا تھا چنے اور مٹر بھی اس انداز میں دیئے گئے تھے کہ جیسے بہت بڑا احسان کیا گیا ہے اور کھانا تو اگر اسے کھانا کہا جا سکتا ہے۔ غالباً پی سی سین کی گورنمنٹ کا بے مثال کرم تھا ان نظر بند مسلمانوں کی جان پر۔

بہر حال کسی طرح کھانا ہوا۔ بیشتر لوگوں سے کھایا نہ گیا اور دو ایک نوالے زبردستی زہر مار کر کے پانی پی لیا۔ چھ بجے تالہ بندی کی گھنٹی ہوئی۔ ایک ڈپٹی جیلر اور جمعدار ہر کمرے میں آئے آدمی گنے اور تالہ بند کر دیا گیا۔ ساتھ ساتھ یہ نادر شاہی حکم بھی دے دیا گیا کہ کل صبح سب سے پہلا کام قیدی یہ کریں گے کہ کس نمبر کمرے میں کون کون ہے اس کی فہرست بنا کر پیش کریں تاکہ اہل کاران سرکار کو گنتی میں آسانی ہو۔ مولانا خلیق الرحمن صاحب (ایلیٹ روڈ) نے اس پر اعتراض کیا کہ لسٹ آپ خود بنائے اور یہ کہ جیل کے اندر قیدیوں کو نقل و حرکت کی آزادی ہونا چاہئے اسلئے ہر کمرے میں ہر ایک کے جان پہچان کے لوگ موجود ہیں لہذا اگر وہ ایک رات کسی اور کمرے میں گذارنا چاہیں تو اس پر اعتراض نہ ہونا چاہئے اور سب لوگوں کو اپنے اپنے کمرے تک محدود نہ رکھا جائے۔ ڈپٹی جیلر نے اس بات کو نہ مانا اور اصرار کیا کہ فہرست اسے صبح مل جائے ورنہ دوسرے

روز تالانہ کھولا جائے گا۔ اگرچہ بعد میں یہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو منتقلی جاری ہو گئی تھی۔ اور جیل کے جمعدار اور پولس والے اس پر اعتراض نہ کرتے تھے اسلئے کہ ان کو قیدیوں سے ہزاروں روپے روز کی آمدنی تھی اور خصوصاً شہاب لکھنوی کو آزادی تھی کہ وہ ہر روز ایک نئے کمرے میں اپنی شاعری اور ترنم سے لوگوں کو مسرور کرتے رہیں

پہلی رات

جیل میں قیدیوں کی یہ پہلی بھیانک رات تھی۔ وہ چوہوں کی طرح اپنے اپنے بارکوں میں بند تھے۔ پانی کسی نے لیا تھا، کوئی جلدی میں بھول گیا تھا، جن کے پاس تھا وہ دوسروں کی حتی الامکان مدد کر رہے تھے۔ پاخانہ ایک تھا اور جانے والے سو ڈیڑھ سو۔ پھر صرف استنجا کیا جا سکتا تھا۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ ادریس صاحب فرنیچر والے کو اسی رات دل کا دورہ پڑا، بہت زیادہ چیخ اور شور کے بعد جیل دفتر سے آدمی آیا اور انہیں جیل کے دواخانے لے جایا گیا جس کو ہسپتال کہنا ہسپتال کا مذاق اڑانا ہے۔ بہرحال فون کیا گیا اور پریسیڈنسی جیل سے ڈاکٹر آیا تو اس نے انہیں دوا دے کر سلایا۔ لوگوں نے عشاء کی نماز کمروں کے اندر ہی پڑھی۔ سب بند تھے لیکن یہاں بھی ایک ایسا فرد موجود تھا جس کو جیل کے دفتر میں رات ساڑھے دس بجے تک رہنے اور اپنی رپورٹ دینے کی آزادی تھی۔ یہ گورنمنٹ کا انفارمر یہاں بھی موجود تھا۔ چنانچہ بدرالدجیٰ صاحب کے کمرے میں اس کو آمد و رفت سے منع کر دیا گیا اور سارے جیل میں وہ آزادی سے گھومتا پھرتا رہا۔ جب دیکھا کہ سب اس کی حیثیت سے واقف ہو گئے ہیں تو ایک رات کو جیل سے چلا بھی گیا۔

اگرچہ پہلی رات قیدیوں پر بڑی گراں گذر رہی تھی اور بعض افراد رو بھی رہے تھے۔

ہراساں بھی تھے۔ خوفزدہ بھی تھے لیکن بیشتر اپنے مقسوم پر شاکر تھے۔ حالانکہ ان کی یہ پہلی گرفتاری تھی لیکن زیادہ تر لوگ زیادہ پریشان نہ تھے اللہ تعالیٰ پر شاکر تھے۔ اگرچہ ایک اندیشہ انھیں بھی کھائے جا رہا تھا اور وہ تھی اپنے اپنے گھروں کی فکر، باہر بلیک آؤٹ تھا زیادہ تر لوگ محلوں سے آکر جیل میں بند تھے مسلم محلّے اس قدر خاص طور پر انتہائی نازک دور سے گذر رہے تھے تو وہاں عورتیں اور بچے تھے یا پھر ایسے مرد جو بے چارے کسی بحران کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے لہٰذا اس وقت کلکتہ کا مسلمان فرقہ پرستوں کے رحم و کرم پر تھا۔ مسلم محلوں میں اگر فساد ہو جاتا تو مسلمانوں کی کمر ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتی۔ نہ معلوم کون سی مصلحت کیسا اندیشہ اور کیسا معجزہ تھا جسنے فرقہ پرستوں کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

جیل کی پہلی رات گرفتار شدگان میں سے بیشتر کے لئے قیامت سے کم نہ تھی کچھ گھروں کی فکر، کچھ بھوک کی اذیت، کچھ اپنی زبوں حالی کا احساس، کچھ بے بسی کا احساس، ایک عجیب عالم تھا، کچھ کراہ رہے تھے، کچھ رو رہے تھے۔ کچھ یادِ خدا میں مشغول تھے اور کچھ لوگ اپنی جگہ پر لیٹے باہر رات کی تاریکی میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ شاید اپنا خوفناک حال اور غیر یقینی مستقبل۔ قریب قریب سب ہی کمبلوں کے اندر بسے ہوئے حشرات الارض سے پریشان تھے اور بدن کھجا رہے تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ اگر حالات سازگار ہوتے، سکون ہوتا۔ اور نیند آتی بھی تو کھٹمل، پسو، اور جوئیں جو کمبلوں میں آباد تھیں انھیں نہ سونے دیتیں۔ ادریس صاحب کو جب دل کا دورہ پڑا اور ایک کمرے میں ہنگامہ ہوا تو ہر کمرے کے لوگ چڑیا خانے میں بند جانوروں کی طرح یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ کیا ہوا۔ جو لوگ دور تھے وہ چلا چلا کر دریافت کر رہے تھے کہ کیا ہوا اور جو لوگ قریب تھے وہ انھیں چلا کر بتا رہے

تھے اتنے میں چند سپاہی اور جمعدار آگئے اور قیدیوں کو ڈانٹنے لگے کہ جنگ ہو رہی تھی۔ بلیک آؤٹ ہے وہ نہ چلائیں اور خاموشی سے سو جائیں۔ جیسے یہ جنگ کلکتہ ہی میں لڑی جا رہی تھی۔

آہستہ آہستہ سناٹا چھا گیا ایک بھیانک اور ہیبت ناک سناٹا، رات گزرتی رہی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ ٹھیک چھ بجے صبح دروازہ کھلا اور جمعدار اور سپاہی اندر آئے۔ پھر سے قیدیوں کی گنتی ہوئی اور انہیں درست پا کر سپاہیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ قیدیوں نے پاخانے کے متعلق پوچھا تو تالاب کی دوسری جانب ایک لمبے کھلے ہوئے شیڈ کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ جب لوگ وہاں گئے تو دیکھا کہ اس شیڈ میں کھڈیوں کی دو قطاریں بنی ہوئی ہیں اور اس انداز میں کہ دو قیدی ایک دوسرے کو ننگا دیکھ سکتا ہے۔ قیدیوں نے احتجاج کیا تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ اگر جانا ہے تو اسی پاخانے میں جاؤ ورنہ نہ جاؤ۔ بہر حال دو دو پر بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح ضروریات سے فارغ ہوئے حوض اور نلوں اور تالاب میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ کیونکہ صرف ہوا اور پانی ہی اس جیل میں با افراط میسر تھے۔ ابھی لوگ پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ یکایک گھنٹی بجی اور لوگوں کو ناشتہ کیلئے بلایا جانے لگا۔ ناشتہ کیا تھا، تھالی میں دو مٹھی چنے یا مٹر جو اُبلے ہوئے اور گڑ کی چائے جو پانی میں تھوڑی سی ڈال دی جاتی تھی جو نہ گرم تھی نہ میٹھی۔ صرف ذرا مٹھاس والا گرم پانی معلوم ہوتی تھی۔

بیشتر قیدیوں نے یہ بھی نہ لیا اور بھوکا رہنا گوارہ کیا۔ جیلر اور ڈپٹی جیلر سے سخت احتجاج کیا گیا جنہوں نے بتایا کہ ابھی آپ لوگوں کا ڈویژن نہیں آیا ہے جب تک یہ آرڈر نہ آئے گا اس وقت تک یہی سب ملے گا۔ اسی دوران باہر گرفتار شدگان کے اعزاء، لواحقین اور

خواتین کا مجمع جمع ہو چکا تھا اور انہیں اس کی خبر ہو چکی تھی کہ ان کے عزیز جیل کے اندر بھوکے ہیں۔ انہوں نے جیل کے پھاٹک پر بھوک ہڑتال کر دی اور بعض لوگ دوڑ کر پریسیڈنسی جیل سپرنٹنڈنٹ گھوش کے پاس گئے اور ان سے احتجاج کیا کہ یا قیدیوں کو مناسب خوراک دی جائے ورنہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانا منگوا کر کھائے، سپرنٹنڈنٹ گھوش فوراً اسپیشل جیل آئے اور قیدیوں سے ملے۔ قیدیوں نے بھی زبردست احتجاج کیا۔ انہوں نے ڈی آئی جی جیل کو فون کیا اور اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا

قیدیوں کو خصوصی اجازت مل گئی کہ وہ اپنے گھروں سے کھانا منگوائیں۔ تولیہ، صابن، کپڑے وغیرہ بھی منگوائیں اور اگر جیل کے آفس میں کچھ رقم ان کے گھر والے جمع کرا دیں تو انہیں سگریٹ، بیڑی، پان وغیرہ بھی مل سکتا تھا۔ اس رعایت نے اور رعائتوں کو بھی جنم دیا۔

قیدیوں میں زیادہ تر متمول لوگ تھے۔ ڈیڑھ بجے دن تک ان کے گھروں سے کھانا آگیا۔ متوسط درجے کے افراد کے اعزا بھی دوڑ دھوپ کر کچھ بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے اور جیل آفس میں کافی رقوم جمع ہو گئیں۔ اب جیل کے اسٹاف کے کان بھی کھڑے ہوئے کہ یہ قیدی تو کسی دوسری قسم کے ہیں جو آناً فاناً یہ سب کچھ کرا سکتے ہیں تو یہ سونے کے کان ثابت ہوں گے۔ اب سپاہیوں نے اشارہ کرنا شروع کیا کہ اگر قیدی خط بھیجنا چاہیں، کچھ منگوانا چاہیں تو وہ لا دیں گے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ قیدیوں کو تو اپنے گھروں کے حالات جاننے کی بے چینی تھی ہی۔ انہوں نے دھڑا دھڑ خطوط لکھ کر دینا شروع کئے اور اعزا کو ہدایت لکھ دی کہ ۲۰، ۲۵، ۳۰، ۵۰ روپے جو مانگیں ان سپاہیوں کو دیں۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی ملتا تھا اور ناشتہ پانی بھی۔ جیل کا سارا اسٹاف ان قیدیوں کی موجودگی تک خوب مزے کرتا رہا اور

ہزاروں اکٹھا کئے۔ اگرچہ بعد میں خطوط پہنچانے کا ریٹ کم ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ٹیکسی کا کرایہ اور پانچ روپے فی خط تو کبھی کہیں نہیں گئے۔

بہر حال اس سے پہلے روز کے بیرونی اور اندرونی احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدیوں پر جو عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا وہ حالت نہ رہی بلکہ نظر بند مسلمانوں کے لئے اب زندگی کسی قدر قابل برداشت ہو گئی تھی۔ حالانکہ ڈیڑھ بجے دن کو جب گھر سے ٹفن بکسوں میں کھانا آیا اور ڈیڑھ دن کے بھوکے اسے کھانے بیٹھے تو عجب منظر تھا۔ اکثر لوگ رو رہے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کے گھروں سے کافی کھانا آیا تھا۔ اور تا مدت نظر بندی آتا رہا۔ اور انہوں نے اپنے دستر خوان پر انتہائی فراخ دلی سے اپنے ان بھائیوں کو شریک کیا جو اس قدر متمول نہ تھے کہ ان کے گھروں سے کھانا آسکتا۔ جن لوگوں کو فرسٹ ڈویژن ملے انہوں نے اپنے ڈویژن کا کھانا بھی اپنے غریب بھائیوں کو اپنے دستر خوان کے کھانے کے علاوہ دیا۔ اور اس طرح اخوت اور رواداری کا ثبوت دیا۔ یہ امر قابلِ صد ستائش ہے کہ بعض اصحاب تو اپنے مہمانوں کی خاطر کرنے میں خود بھوکے رہ جاتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ مقام افسوس بھی ہے کہ بعض افراد نے جو متمول بھی تھے، انتہائی مذہبی بھی بنتے تھے اور بڑے ہوٹلوں کے مالک تھے انتہائی تنگ دلی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے غریب بھائیوں کو اپنے گھروں سے آئے ہوئے مرغن کھانوں، پلاؤ، مرغی میں شریک نہ کیا بلکہ یہ کھانا جو کافی مقدار میں آتا تھا اور بچ جاتا تھا تو اس میں ہاتھ دھو دیتے تھے اور اسے پچھواڑے پھنکوا دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی اس حرکت کا بہت برا مانا اور کئی بار تو سزا کے طور پر ان کے ٹفن بکس غائب کر دیئے گئے اور تالاب میں پھینک دیئے گئے۔ چنانچہ درجنوں ٹفن بکس

شاید اب تک اس تالاب میں ان کی خود نفسی کے ثبوت کے طور پر موجود ہوں گے
لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسے لوگ صرف چند ہی تھے۔ کثرت ایسے لوگوں کی تھی جو انتہائی فراخ دلی سے دوسروں کی مصیبت بانٹتے تھے۔ ان کی مالی امداد کرتے تھے ان میں کپڑے بانٹتے تھے۔ ان کے گھروں کو روپے بھجواتے تھے۔ ویسے بھی بیشتر لوگوں کے یہاں سے جو کھانا آتا تھا وہ شاید انہیں عام دنوں میں ان کی بیویاں نہ کھلاتیں لیکن اس قید کے زمانے میں حتی الامکان گھر والوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اچھے سے اچھا کھانا جائے اور زیادہ سے زیادہ جائے تاکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کھایا جا سکے اور ایسا ہی ہوا ایک ایک دسترخوان پر بارہ بارہ پندرہ آدمی بلائے جاتے تھے انہیں زبردستی شریک کیا جاتا تھا۔ بعض خوددار لوگ اس سے گریز کرتے تھے لیکن تاج محمد صاحب، رفیق بھائی، عنایت الرحمٰن صاحب وغیرہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ بٹھاتے تھے اور کمرے کمرے دعوتیں ہوتی تھیں۔ گھوم گھوم کر یہ دعوتیں انہیں لوگوں کو دی جاتی تھیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا۔ بعد میں اس قدر سہولت ہو گئی تھی کہ کچھ لوگ اگر ایک کمرے میں رہتے ہوئے دوسرے کمرے میں رات بسر کرتے تو اس پر اسٹاف کو اعتراض نہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ شہاب لکھنوی کی مانگ تھی۔ اس لیے کہ خوش گلو اور خوش بیان شاعر تھے اور لوگ مشتاق رہتے تھے کہ ان کا کلام سنیں۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم ابتدائی چند روز کی روئداد ذرا تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس تاریخی دستاویز میں ان چند دنوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان چند دنوں کے بعد مسلمان نظربندوں کی زندگی ایک ہنج پر آگئی ان میں سے بیشتر ۱۹ روز کے بعد ہی التوائے جنگ ہونے ہی چھوڑ دیئے گئے۔ پھر ترتیب دار

فہرستیں آتی رہیں اور لوگ رہا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ پوجا کی چھٹیاں آگئیں اور کچھ لوگ اٹک گئے اور انہیں عید کے چند روز پہلے جنوری ۶۶ء میں چھوڑا گیا۔

بہرحال کھانا کھانے کے بعد مسلمانوں نے شکر خدا کیا اور ظہر کی نماز بھی ایک بردست اجتماع کی صورت میں میدان میں ادا کی گئی۔ اس کے بعد ایک دوسرے کی حالت دریافت کی گئی۔ کچھ لوگوں کو ہر کمرے میں تعینات کیا گیا کہ وہ اپنے کمرے کے لوگوں کی فہرست بنائیں تاکہ اسے جیل آفس میں شام سے پہلے داخل کیا جا سکے۔ یہ کام بھی شروع ہوا لیکن اسمیں نام لکھنے اور کمرے کے تعین میں آپس میں ذراسی تلخی ہو گئی۔ مولانا ابوالفتاح (جماعت اسلامی) بھی بگڑ گئے۔ اشتیاق حسین صاحب وکیل بھی خفا ہو گئے۔ ابوالکلام صاحب بھی چلانے لگے اور روح القدر کابل بھی۔ خیر بڑی مشکل سے یہ فہرست تیار ہوئی اور جیل آفس میں دی گئی۔ اس طرح چار بجے۔ ساڑھے چار پھر کھانا آنا شروع ہو گیا اور لوگ اپنا اپنا کھانا سنبھالنے لگے۔

دوسرا دن بھی گذر گیا۔ شام ہوئی اور لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند کر دیئے گئے۔ آج شام کو یہ لوگ زیادہ آسودہ اور پرسکون تھے۔ پیٹ میں غذا تھی۔ گھر کی خبر باہر آنے والے اقارب کے توسط سے اور سپاہیوں کے ذریعہ تھوڑی بہت آہی گئی تھی کہ فی الحال محلے پرسکون ہیں۔ اگرچہ ہیجان اور خوف و دہشت ان کا نصیب بن چکی ہے لیکن لوگ اپنی اپنی قسمت پر شاکر جیل کے اندر اور باہر کلکتہ کے وسیع تر جیل خانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر آنے والی آفت کے لئے تیار ہیں۔ صرف اندیشہ اس بات کا ہے کہ اگر مشرقی محاذ بھی کھل گیا تو سیکورٹی زیادہ سخت ہو جائے گی۔

کلکتہ براہ راست دشمن کے حملوں کی زد میں ہوگا اور مسلمانانِ کلکتہ کے مصائب ہو سکتا ہے شدید تر صورت اختیار کر لیں۔ یہ بے چینی تو بہر حال تھی لیکن ساتھ ساتھ آسودہ جسموں نے ذہنوں کو بھی ایک طرح کا سکون بخش دیا تھا اور لوگ اب کمبلوں میں چھپے حشرات الارض سے نمٹنے کے لئے اپنے کو تیار کر رہے تھے کہ یکایک جیل کے پھاٹک کی طرف سے ایک چھوٹا سا ہنگامہ اٹھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک مخصوص ڈاکٹر صاحب مادر زاد ننگے ہو کر سونے کے عادی تھے لہٰذا ان کے ساتھ کمرے میں رہنے والے لوگوں کو اعتراض ہوا اور انہوں نے جیل کے حکام سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو کسی الگ مقام پر منتقل کر دیں۔

چنانچہ جیل کے حکام نے یہ بندوبست کیا کہ جیل کے اندرونی احاطے کے باہر کچھ اینٹ اور ٹین کے شیڈ تھے۔ ان میں سے ایک میں ڈاکٹر صاحب کو منتقل کر دیا۔ وہاں وہ تنہا سوئے انہیں وہاں ایک کیمپ کاٹ دے دیا گیا تھا چونکہ فرش کچا تھا۔ وہاں وہ اپنے ایک مقدمہ کے سلسلے میں جو ان پر چل رہا تھا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنا مقدمہ خود بغیر کسی وکیل کی مدد کے لڑ رہے تھے۔ پیشی کے لئے انہیں دوران نظر بندی بھی عدالت لے جایا گیا۔

ہنگامہ اور ہیجان کی ایک دوسری وجہ ایک اور معزز قیدی کی آمد تھی جو دوسرے روز شام کو تشریف لائے۔ یہ تھے نواب مشرف حسین آف جلپائی گوڑی کے داماد اور غلام کریم صاحب سکریٹری محمڈن اسپورٹنگ کلب کے والد جناب غلام کبریا صاحب۔ لیکن ان کی آمد دوسرے نظر بندوں سے مختلف تھی۔ ان کے ساتھ ان کا بستر، کپڑے، حتیٰ کہ ایک بجلی کا ٹیبل فین بھی تھا۔ کافی لدے پھندے آئے اور جیل کے ایک گوشے میں دو منزلے پر تاج

صاحب وغیرہ کے ساتھ انہیں ٹھہرایا گیا۔ انہیں جاتے ہوئے تمام نظر بندوں نے دیکھا اور حیرت کی اس لئے کہ ان سے جو سلوک ایک روز پہلے روا رکھا گیا تھا۔ یہ سلوک اس سے بالکل مختلف تھا۔ اکثر لوگوں کو تو گرفتار کرنے والوں نے کپڑے بدلنے کی بھی مہلت نہ دی تھی۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق تو حاجی عبدالقیوم صاحب کو صرف گنجی پہنے ہوئے تھانے لے جایا گیا انہیں تو اتنی کی مہلت بھی نہ دی گئی کہ وہ کرتا پہن لیں، اکثر لوگوں کو گھروں سے تھانے پیدل ہی لے جایا گیا۔ اس لئے کہ مختلف علاقوں میں مختلف افراد کی گرفتاری ہوئی۔ اکثر لوگ گلیوں میں رہتے تھے۔ پولس کو وہاں گھس کر انہیں گرفتار کرنا پڑا اور اس وسیع مہم کے لئے نہ پولیس کے پاس گاڑیاں تھیں نہ اس قدر فورس۔ ہاں البتہ تھانوں میں لوگوں کو جمع کرنے کے بعد انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح گاڑیوں میں بھر کر جیل پہنچانا زیادہ آسان تھا اور ایسا ہی کیا بھی گیا۔ بہر حال اس عریض و بسیط پنجرے یعنی علی پور اسپیشل جیل کے احاطے میں ایک اور پنچھی کا اضافہ ہو گیا۔

جیل کے حکام سے ٹکراؤ

تیسرا دن بھی چونکہ اپنی رنگا رنگ سرگرمیوں کے لحاظ سے کافی اہم تھا اس لئے اس کی بھی تھوڑی سی تفصیل سنتے چلئے۔ اس روز زیادہ تر انتظامی امور میں جیل کے باسیوں اور جیل کے اسٹاف میں ٹکراؤ ہوا۔ اور جو سمجھوتے ہوئے ان کا دور رس اثر ہم نظر بندوں کی آئندہ مدت حراست پر بڑا اہم ہوا۔ مثلاً یہ کہ فرسٹ ڈویژن والوں کی لسٹ آگئی اور جیل کے حکام نے اعلان کیا کہ جن لوگوں کے نام فرسٹ ڈویژن کی فہرست میں ہیں انہیں پاؤ روٹی اور مکھن ناشتہ میں ملا کرے گا۔ اس پر ہم لوگوں نے زبردست احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ سارے نظر بندوں کو پاؤ روٹی اور مکھن ناشتے میں دیا جائے۔ حکام نے یہ بات تو کماحقہ نہ مانی لیکن یہ ضرور مان گئے کہ مکھن اور روٹی خود نظر بندوں کو دے دی جایا کرے گی اور وہ اسے اپنے طور پر آپس میں تقسیم کرلیں، چنانچہ چند افراد کے ذمے یہ تقسیم کا کام لگا دیا۔

اچھا ناشتہ ملنے لگا چائے کی بھی کوالٹی بہتر ہو گئی اور مقدار بھی بڑھا کر دی جانے لگی حالانکہ زیادہ تر لوگ اپنے گھروں سے آئی ہوئی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے۔

دوسرا ٹکراؤ حکام سے ہسپتال کے اور دواؤں اور ڈاکٹر وغیرہ کی سہولتوں کے بارے میں ہوا۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب افراد کا ایک جگہ رہنا یقیناً صحت اور علالت کے مسائل پیدا کرتا ہے اور پہلے ہی روز سے کافی تعداد میں لوگوں کی مختلف بیماریاں سامنے آئیں جن کا علاج کرنا اب جیل کے حکام کی ذمہ داری تھی کیونکہ یہ سب قید تھے۔ اور از خود کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کچھ ذیابیطیس کے مریض تھے۔ کچھ دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ کچھ کو بلڈ پریشر تھا۔ کچھ کے پیٹ چنا اور مٹر کی خوراک سے خراب ہو گئے۔ کچھ کو ذہنی ہیجان اور جسمانی تکان کی وجہ سے بخار آ گیا اور ریس فرنیچر والے کو ہرٹ اٹیک پہلے ہی روز ہو گیا تھا اور وہ جیل کے دواخانے کی ایک چارپائی پر بے دوا پڑے تھے۔

جب یہ باتیں ڈپٹی جیلر کے دورے کے دوران ان کے گوش گذار کی گئیں تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ دو ایک دن میں سارا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن یہ طبی امداد کا مسئلہ تھا۔ دواخانے میں بڑی بیماریوں کا تو کجا چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی شکایتوں مثلاً پیچش، بخار، کھانسی، نزلہ کی بھی دوا نہیں تھی، صرف کچھ ٹنکچر آیوڈین اور تھوڑا سا سرخ مکسچر موجود تھا۔ چنانچہ قیدیوں نے پھر احتجاج کیا۔ نتیجہ کے طور پر جیلر خود آئے۔ وہ ایک اچھے آدمی تھے۔ وعدہ کیا کہ فوراً کچھ کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر گھوش ایک بار پھر اسپیشل جیل آئے ان کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا، جس کو ہدایت کی گئی کہ وہ صبح شام آ کر مریضوں کو دیکھا کرے اور اس چھوٹے سے دواخانے کو چار بیڈ کا ایک ہسپتال بنا دیا گیا۔ اس میں بیڈ رکھ دیئے گئے اور مریض کی دیکھ بھال کے لئے اسٹاف بھی بڑھا دیا گیا جو پرانے قیدیوں پر مشتمل تھا۔ دوائیں بھی دو ایک روز کے اندر ہی کافی مقدار میں فراہم کر دی گئیں اور اب سوا

بڑی اور الجھی ہوئی بیماریوں کے دوسرے چھوٹے موٹے امراض اور عام طور پر پرانی بیماریوں کے علاج کا سارا بندوبست کم و بیش جیل کے اندر ہی ہو گیا۔ اور یہ نظر بندوں کی دفتر شاہی کے خلاف ایک اور فتح تھی۔

تیسرا ٹکراؤ نظر بندوں کا جیل کے اس اسٹاف سے ہوا جو اندرونی پھاٹک کے باہر اور بیرونی پھاٹک کے اندر کی غلام گردش میں شب قیدیوں کے اسپیشل کھانوں کی جانچ پر مقرر تھا اس کا کام یہ تھا کہ دیکھے کہ کھانے کے اندر کوئی خط یا ہتھیار وغیرہ تو چھپا کر نہیں بھیجا جاتا۔ اور گائے کا گوشت سختی سے منع تھا۔ نشیات پر بھی پابندی تھی۔ یہ تو آئینی طور پر ضابطہ کے مطابق تھا اور کسی کو اس پر اعتراض نہ تھا لیکن کئی دفعوں کا جو کھانا آیا تو یہ دیکھا گیا کہ اوّل تو گندے گندے ہاتھوں سے متعینہ قیدی کھانے کو چیک کرتے تھے دوسرے جتنے بھی نظر بند تھے ان کے گھروں سے ان کی استطاعت سے کہیں بڑھا کر کھانا بھیجا جاتا تھا۔ مرغی، پلاؤ، بہترین سالن، شامی کباب، پراٹھے سب ہی ہوتے تھے۔ اور ان میں سے بیشتر مقدار جیل کا اسٹاف "چکھنے" ہی میں صاف کر دیتا تھا۔ مثلاً کسی کے وہاں سے مرغی آئی تو چیک کرنے کے بعد اندر آتے آتے کچھ ہڈیاں اور شوربا باقی رہ جاتا تھا اور باقی جیل اسٹاف کے پیٹ میں پہنچ جاتا تھا۔ پلاؤ کی بوٹیاں غائب الٹا پلٹا ہوا کہ کھانے کو جی نہ چاہے۔ قیدیوں نے جب یہ حال دیکھا کہ گھر والے تو محنت کر کے اپنے مالی ذرائع سے بعض اوقات کہیں زیادہ بڑھ کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر ہمیں اچھے اچھے کھانے بھیجتے ہیں جو ہمیں باہر شاید دعوت ہی میں نصیب ہوتے اور جیل کا اسٹاف اس بے دردی سے اسے کھا جاتا ہے اور باقی کو کھانے کے ناقابل کر دیتا ہے تو انہوں نے اس بہ زبردست

احتجاج کیا اور اس احتجاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل اسٹاف کے ساتھ نظر بندوں کے کچھ نمائندوں کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ نگرانی کرتے رہیں صرف چیک کیا جائے کھانے کو برباد نہ کیا جائے۔ ویسے جیل اسٹاف کی خواہش پر پھر بھی کچھ چیزیں انہیں دے دی جاتی تھیں۔ مثلاً کسی نے ایک شامی کباب مانگ لیا۔ کسی نے مرغی کی ایک ٹانگ کسی نے پراٹھے اور نگراں نظر بندی فراخ دلی سے ان کی یہ خواہش پوری کر دیتے تھے، صابن، کریم، سگریٹ، وغیرہ بھی جیل کے اسٹاف کو دیئے جاتے تھے اور جو روپیہ اخراجات کے لئے قیدیوں کے اعزار جیل میں جمع کراتے تھے اسمیں سے کافی رقم یا تو سپاہیوں کو گھر بھیجنے۔ پیغام بھجوانے اور منگوانے۔ اشیاء کی خریداری وغیرہ میں جاتی تھی یا جیل کے اسٹاف کو بھی اسمیں سے دیا جاتا تھا تاکہ وہ خوش رہیں اور قیدیوں کے کام میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔

چوتھا ٹکراؤ اس ڈپٹی جیلر کی وجہ سے ہوا جس سے پہلے روز ہی ایک زبردست جھڑپ ہو چکی تھی اور جسکے متعلق سپرنٹنڈنٹ جیل سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسے یہاں سے ٹرانسفر کر دیا جائے۔ اس کی تبدیلی کا آرڈر آچکا تھا اور وہ دوسرے روز جانے ہی والا تھا کہ جاتے جاتے اس نے قیدیوں پر ایک سختی کر ہی دی۔ اسپیشل جیل کی جائے وقوع ایسی تھی کہ اس کے دو طرف راستے جاتے تھے اور ان راستوں کو جیل کے دو منزلے کے اس حصہ سے دیکھا جا سکتا تھا۔ جہاں ہم لوگ مقیم تھے۔ چنانچہ جب نظر بندوں کو اندر اور ان کے اعزار کو باہر یہ پتہ چلا کہ یہ ایک ذریعہ ہے قیدیوں کے لئے ایک جھلک دیکھنے اور دکھلانے کا تو ان کھڑکیوں میں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں

قیدیوں کی ایک بھیڑ شام کے وقت رہنے لگی۔ جبکہ لوگ کھانا لے کر آتے تھے تو راستے پر کھڑے ہو کر اندر اشارے کرتے تھے اور اندر والے کسی نہ کسی طرح اشاروں میں ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اندر کی بھیڑ پر پہلے نظر نہ پڑی لیکن باہر لوگوں کی بھیڑ کو جیل کے محافظوں نے دیکھا اور منتشر کر دیا۔ اس کا ردعمل اندر ہونا ضروری تھا۔ شام کو ڈپٹی جیلر مع سپاہیوں کے آگیا اور تمام قیدیوں کو کھڑکیوں پر سے ہٹا دیا گیا۔ کھڑکیوں کو بند کر کے ان پر تختے لگا دینے کا حکم دے دیا گیا۔ لہذا دوسرے روز یہ بھی ہو گیا اور قیدیوں کے لئے باہر سے رابطہ قائم کرنے کا یہ ذریعہ بھی ڈپٹی جیلر جاتے جاتے ختم کر گیا۔ ابھی انٹرویو کا بھی اجازت نامہ نہ آیا تھا۔ لہذا اپنی دانست میں اس نے قیدیوں پر سارے دروازے بند کر دیئے تھے اسے یہ خبر نہ تھی کہ درمیانی عمارت کی چھت سے جیل کے باہر جو ایک پل تھا اور دور کی جو ایک سڑک تھی۔ وہ نظر آتی تھی اور قیدیوں نے اب وہاں سے اپنے جذبہ کی تسکین کرنا شروع کر دی تھی۔ اس طرح اگرچہ ایک فتح جیل کے حکام کو ہوئی لیکن قیدیوں نے ایک اور متبادل ترکیب نکال لی اور یہ حکم ادھ بھی زیادہ نقصان دہ ثابت نہ ہوا۔

جیل میں اخبارات بھی آنا شروع ہو گئے تھے اور جنگ کی دہشت انگیز خبریں آرہی تھیں۔ زیادہ تر یہ اندیشہ تھا کہ کب مشرقی محاذ کھلتا ہے۔ شہر میں جو افواہیں اڑ رہی تھیں وہ بتدریج جیل کے اندر بھی پہنچ رہی تھیں کیونکہ سپاہیوں کا قیدیوں کے گھر آنا جانا شروع ہو چکا تھا اور وہاں سے خطوط آتے رہتے تھے۔ جیل کی زندگی

میں ایک پابندی، ایک ٹھہراؤ اور ایک منظم سا استقلال آگیا تھا۔ نماز باقاعدہ جاری تھی۔ باجماعت اور پابندی سے پڑھی جاتی تھی۔ خصوصًا دن کو ظہر کی نماز کا نظارہ روح پرور ہوتا تھا۔ ویسے بھی جگہ جگہ ذوق کے مطابق محفلیں جمی رہتی تھیں۔ کچھ لوگ سیاسیات سے دلچسپی لیتے تھے اور بدرالدجیٰ صاحب کے کمرے میں ان کا جماؤ رہتا تھا۔ کچھ لوگ لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ کچھ دینی ذکر اذکار میں محو رہتے تھے بعض شاعری سے۔ کچھ لوگ تاش سے دل بہلاتے تھے۔ صرف چند ایسے افراد تھے جو انتہائی نروس اور قنوطی قسم کے تھے۔ اور جو خود بھی پریشان نظر آتے تھے اور دوسروں کو بھی اپنے اندیشوں اور رونے دھونے سے پریشان کرتے رہتے تھے۔ کچھ ۲۴ پرگنہ کے بنگالی بھائی اپنے پیر مولانا غلام علی صاحب کے گرد جمع رہتے اور مسئلہ مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ کچھ لوگ نیم سنجیدگی سے بوڑھوں کے پیر صاحب حاجی محمد قاسم صاحب کی باتیں سنتے تھے۔ یہ ایک الگ شخصیت تھی دبلے پتلے منحنی سے زلفیں رکھے سنہری پگڑی باندھے قاسم صاحب پیشن گوئیاں کرتے رہتے تھے۔ اور لوگ مسکراتے تھے اور سنتے تھے۔ شوکت پنجابی (پھول بگان) نروس لوگوں میں سب سے آگے تھے اور اگر وہ پہلے ہی گروپ میں نہ چھوٹ جاتے تو غالبًا بیمار پڑ جاتے۔ کچھ لوگ نروس تھے لیکن برداشت کرتے تھے وہ جیل سے باہر آکر بیمار پڑے اور ایسے پڑے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس بے عزتی اور خواری کے صدمے نے انہیں زندہ نہ رہنے دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ ان کی زندگی کے اختصار اور ٹریجڈی کی مجرم مغربی بنگال کی پی سی سین حکومت تھی جسے قدرت نے معاف نہ کیا اور آخر کار مظلوموں کی آہ نے اسے ملیامیٹ کر دیا۔

ڈاکٹر رحیم کی شخصیت بھی بڑی باغ و بہار تھی۔ وہ اپنی "انگریزیت" اور قانون کی کتابوں کے ساتھ ایک مستقل موضوعِ تفریح بنے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں "نمبر وَن" کا خطاب بھی مل گیا تھا۔ حاجی تنویر احمد صاحب، باوجود اپنی ضعیفی کے انتہائی خندہ پیشانی سے اس جیل کی مصیبت کا سامنا کر رہے تھے اور عموماً ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ سید بدر الدجیٰ صاحب تو اس جہاز اسیری کے پرانے مجاہد تھے اور اپنی بعض جسمانی شکایات سے تنگ ہونے کے باوجود بھی وہ اطمینان سے اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے رہتے تھے۔ یہی حالت اور دوسرے "پرانے" یا عادی قیدیوں مثلاً شہاب الکھنوی اور رئیس جعفری کی بھی تھی۔ رفیق بھائی اور ان کے بیشتر ساتھی اس جیل یاترا کو ایک پکنک سے زیادہ اہمیت نہ دے رہے تھے ان لوگوں کو اپنی فکر بالکل نہیں تھی۔ عنایت الرحمٰن صاحب، رفیق بھائی، تاج صاحب، یوسف صاحب (آزاد بوٹ) اور دوسرے حضرات جنھیں خدا نے صاحبِ ثروت بنایا تھا۔ کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ وہ بے بس و مجبور غریب، جنھیں بغیر کسی چھان بین کے بند کر دیا گیا تھا اور جن کے گھروں میں کچھ نہ تھا۔ انہیں لوگوں کی پوشیدہ امداد کے مرہونِ منت تھے۔

جیل میں مشاعرہ

دن اور رات کا چکر بدستور جاری تھا۔ ڈاکٹر ظفر سرکار کچھ پاکستانی جہازیوں اور دوسرے نوجوان نظر بندوں نے مل کر "والی بال" کا انتظام بھی کر لیا تھا تاکہ کچھ ورزش ہوتی رہے۔ کیونکہ دن بھر اور رات بھر سوا کھانے اور بیٹھے رہنے یا سو جانے کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ غذائیں اس قدر ثقیل پہنچ رہی تھیں کہ اگر ورزش نہ کی جاتی تو ہو سکتا تھا کہ بیماریاں شروع ہو جاتیں۔ شیخ اکبر علی صاحب (ریپن اسکوائر) کو بھی دل کی شکایت ہو گئی تھی۔ یہ خاموش طبیعت انسان خود میں کھوئے رہتے تھے اگر کسی نے بات کی تو انتہائی خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ورنہ خاموش رہتے تھے۔ اور جیل کے اندر اور باہر جہاں تک ہوتا تھا کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے۔ بزرگ اور عمر رسیدہ لوگوں نے تو یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ صبح شام جیل کے اندر تالاب کے کئی چکر کاٹ لیتے تھے اور اس طرح ان کی ورزش ہو جاتی تھی اور جوانوں نے "والی بال" کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

اقبال اکرامی صاحب کو ایک نئی تجویز سوجھی کہ جب عباس علی خاں بیخود، شہاب لکھنوی، سلیمان مہر صاحب وغیرہ کئی شاعر موجود ہیں تو کیوں نہ ایک مشاعرہ کیا جائے چنانچہ تیسرے دن یہ اعلان کیا گیا کہ کل ایک طرحی مشاعرہ ہوگا جس کی صدارت بیخود صاحب کرینگے

طرح کیا تھی۔ یہ تو یاد نہیں لیکن اسپر متعدد غزلیں ہوئیں اور شعراء نے ایک کثیر مجمع سے زبردست داد وصول کی، اسکے بعد بھی کئی نشستیں ہوئیں اور جب تک بخو صاحب جیل میں رہے یہ دلچسپی جاری رہی۔

تیسرا روز اسلئے اور بھی اہم تھا کہ ایک تو باہر سے آئے ہوئے خطوط سے یہ پتہ چلا کہ قیدیوں کے اعزا نے ہفتہ وار انٹرویو کیلئے درخواست دے دی ہے اور چند ہی روز میں امید ہے کہ ہفتہ وار انٹرویو شروع ہو جائیں گے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اطلاع دل خوش کن ثابت ہوئی کہ محاذ جنگ میں طرفین کی پیش قدمی رک گئی ہے اور اب جنگ میں تعطل اور ٹھہراؤ آگیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ زیادہ عرصہ جاری نہ رہے گی۔ ویسے اخبارات سے بھی پتہ چلتا تھا کہ التوائے جنگ کے بارے میں دوسرے ملکوں کی طرف سے سلسلہ جنبانی شروع ہو چکی ہے۔ اپلیں ہو رہی ہیں سیکورٹی کونسل میں معاملہ پیش ہے اور روس انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح یہ جنگ رک جائے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عام طور پر چونکہ قیدیوں میں بیشتر یہ نظریہ پایا جاتا تھا کہ ان کی رہائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک جنگ جاری ہے لہٰذا ان خبروں سے انہیں بہت خوشی ہوئی اگرچہ یہ طے تھا کہ ابھی اسمیں دو تین ہفتوں کی دیر ہے لیکن التوائے جنگ کے بعد رہائی کے امکانات روشن ہیں۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ ان کی گرفتاری کے ۱۹ ویں روز التوائے جنگ کا اعلان ہو گیا۔ اور رہائی پانے والوں کی پہلی فہرست آگئی۔ لیکن اس رہائی سے پہلے ایک بہت بڑی ٹریجڈی سامنے آنے والی تھی جسنے سارے نظر بندوں میں غم و غصہ کی ایک تازہ لہر دوڑا دی اور انہیں حکومت وقت سے شدید طور پر متنفر کر دیا۔ ساگر دت لیش کے مطیع الرحمٰن صاحب کو خبر ملی کہ ان کی اہلیہ ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ان کے

گھر پر ایک گیارہ سال کا لڑکا اور دو چھوٹے بچے تھے اور ان کی اہلیہ تھیں۔ جب وہ جیل چلے آئے تو بال بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی صرف ان کی اہلیہ باقی رہ گئی تھیں جو اس وقت ہسپتال میں تھیں اور اب صرف وہ گیارہ سال کا چھوٹا سا بچہ رہ گیا تھا جسکے ذمہ ایک طرف دونوں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال تھی۔ دوسری طرف ماں کو ہسپتال جاکر دیکھنا ان کی خبر گیری کرنا اور تیسرے جیل میں باپ کو کھانا اور دوسری چیزیں پہنچانا۔ اسپر اسکے ساتھی بچوں کے طعنے کہ اسکے والد جیل چلے گئے وہ ایک مجرم کا بیٹا ہے۔

اس روز وہ جیل کے پھاٹک پر انتہائی مایوسی اور ہیجانی کیفیت میں آیا اور مطیع الرحمٰن صاحب کو ایک اطلاع بھجوائی کہ اب حالات برداشت سے باہر ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے اب اس سے یہ سب سہا نہیں جاتا۔ مطیع الرحمٰن صاحب نے فطری طور پر اسے جو اطلاع بھیجی اسمیں اسے تسلی اور تشفی دی کہ چند روز کا معاملہ ہے پھر وہ رہا ہو جائیں گے۔ اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اُدھر ماں کی حالت اسپتال میں بگڑتی گئی اور بچہ اپنی بضاعت سے کہیں زیادہ ذمہ داری سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ دن گذرتے گئے اور والد رہا نہ ہوئے۔ والدہ کی حالت بدتر ہوتی گئی اور حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ اس معصوم بچے نے ان حالات سے گھبرا کر ایک عزم صمیم کر لیا اور اسے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔

پہلا شہید

ایک روز یکایک جیل میں یہ جانکاہ خبر آئی کہ مطیع الرحمٰن صاحب کے بچے نے ٹِک ٹونٹی (TIK-20) پی کر خودکشی کرلی۔ حکومت مغربی بنگال اور سنٹرل گورنمنٹ کی بہیمیت اور بربریت کا یہ پہلا شکار اور مظلوموں اور ستم کشوں کے اس کثیر اجتماع کا یہ پہلا شہید تھا جسنے اپنی معصوم جان پر کھیل کر ظلم وستم کی ایک ناقابل عبور دیوار سے ٹکرا کر اپنے وجود کو پاش پاش کردیا تھا اور جیل کے اندر بند افراد کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے ماحول کی صحیح تصویر دکھلا کر اس مقام پر دوبارہ لا کھڑا کیا تھا جہاں وہ گرفتاری کے روز اول تھے۔

ختم ہوگئی وہ طمانیت جو انہیں عارضی طور پر جیل کے صبح وشام کی یکسانیت نے دی تھی دھواں بن کر اڑ گیا یہ خیال کہ اب جو بدترین المیہ پیش آنا تھا وہ آگیا اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ہم سلاخوں کے پیچھے بند ہیں۔ ایک معصوم نے اپنی قربانی دے کر یہ یاد دلا دیا کہ جیل کی دنیا ہی صرف تمہاری دنیا نہیں۔ جیل کی سختیاں ہی سختیاں نہیں۔ جیل سے باہر بھی ایک وسیع تر جیل ہے جہاں تمہارے اقرباء ہیں۔ دوست احباب ہیں۔ محلہ والے ہیں۔ ایک کلمہ کے شریک بھائی اور بہنیں اور جوان بوڑھے، بچے ہیں جو تمہاری اس قید وبند کی تکلیف سے بھی زیادہ

بڑے سانحے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ جو مر سکتے ہیں، تباہ و برباد ہو سکتے ہیں۔ تم تو جیل میں مرغن کھا رہے ہو اور اپنی رہائی کا انتظار کرنے کے سوا تمہیں اور کوئی کام نہیں۔ باہر والے اس سے بہت زیادہ سخت مرحلے سے گذر رہے ہیں۔ کون جانے کہ انہیں تمہیں قید کے دوران سہولتیں پہنچانے کے لئے کس کس امتحان سے گذرنا پڑتا ہے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تم نے اپنی آزادی داؤ پر لگائی ہے تو انہوں نے اپنی زندگی کی بازی لگا دی ہے۔

جیل بھر میں یکایک اس سانحہ کی اطلاع سے نفرت اور غم و غصہ کا ایک طوفان سا آگیا جسے جیل کے اہل کاروں نے بھی محسوس کیا اور فوراً انتظام کیا گیا۔ مطیع الرحمن صاحب کو ان کے بچہ کی تجہیز و تکفین کے لئے بھیجا گیا ان کے ساتھ انہیں کے محلّے کے عبدالستار صاحب بھی گئے۔ اور پیرول پر دونوں کو جنازہ اٹھنے تک کے لئے رہائی دی گئی ساتھ آرمڈ پولس گئی اور جنازہ اٹھنے اور دفن کے بعد یہ لوگ واپس آئے۔ اس دوران جیل بھر میں ماتم تھا۔ اس حسرت ناک موت پر۔ اور کئی روز تک اس المیہ پر لوگ غمزدہ رہے۔ مطیع الرحمن صاحب کے دل کی حالت تو صرف ان حالات میں ایک باپ ہی سمجھ سکتا ہے جس کا بڑا لڑکا اسطرح کسمپرسی کی موت مرا ہو۔ لیکن پھر بھی انہوں نے انتہائی صبر و ضبط کا ثبوت دیا۔ اس ٹریجڈی کے بعد لوگوں کی نفرت اس ظالم حکومت کی طرف سے زیادہ گہری اور شدید ہو گئی۔ بیشتر لوگوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار اسطرح کیا کہ قسمیں کھائیں کہ باہر جاکر اسکا بدلہ لینگے اور اس حکومت کا تختہ الٹ کر دم لینگے اور ایسا کر کے بھی دکھا دیا۔ اس بچے کی موت نے کئی منصوبوں کو جنم دیا مثلاً یہ کہ باہر جاکر ایک اخبار نکالا جائے جو انگریزی میں ہو اور مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے۔ صاحب دولت لوگوں نے اس سلسلے میں رقم کے وعدے بھی کئے۔ لیکن یہ تجویز بس ذہن تک رہ گئی۔

احوالِ پریشاں

دن گذرتے جا رہے تھے اور زندگی جیل میں ایک معمول پر آگئی تھی۔ ڈپٹی جیلر کا تبادلہ ہوچکا تھا۔ جیل کے حکام ہفتہ میں ایک پوسٹ کارڈ گھر لکھنے کے لئے دیتے تھے۔ اور وہ بھی سنسر ہوکر گھر تک ہفتہ بھر بعد پہنچتا تھا۔ غرض جنگی تحفظ کے تمام اصول برتے جا رہے تھے جیسے جیلوں میں بند یہ ہزاروں افراد ہندوستانی شہری نہیں بلکہ دشمن کے خطرناک ایجنٹ یا پھر جنگی قیدی تھے۔ انٹرویو ہفتہ میں ایک بار ہوتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ نظربندوں کی بیگمات اور بچے جو انٹرویو کے لئے شوہر اور بیوی درمیان میں بیٹھتے تھے اور دو طرف دو آفیسران کی باتیں سننے کے لئے مقرر ہوتے تھے تاکہ وہ کوئی تخریبی باتیں نہ کرسکیں۔ پھر بھی ہم روز درجنوں خطوط اسٹاف کے ذریعہ بھیجے جا رہے تھے اور ان کے جواب آرہے تھے۔ اور اس خط و کتابت کے لئے جدّت بھی ہوجاتی تھی۔

ایس۔ ایم۔ ابوبکر صاحب

مثلاً ابوبکر صاحب (نارکلڈانگہ) کی بیگم پراٹھے بھیجتی تھیں۔ اور ابوبکر صاحب جب انھیں کھانے بیٹھتے تھے تو کسی پراٹھے میں سے تہہ کیا ہوا خط نکلتا تھا جو اس پراٹھے میں رکھ دیا گیا تھا۔ کسی کی بیگم صاحب چاولوں کے نیچے خط رکھ دیتی تھیں۔ کسی کے شامی کباب میں سے پرچہ برآمد ہوتا تھا۔ غرض جدّت طرازیاں جاری تھیں اور انٹرویو بہرحال اسلئے اطمینان بخش تھے کہ اس طرح بال بچوں سے ملاقات ہوجاتی

تھی اور لوگوں کو اپنے انٹرویو کے دن کا بڑی شدت سے انتظار رہتا تھا۔ اگرچہ مجھے اور رفیق بھائی کو شاید ایک یا دو انٹرویو کے بعد ہی رہائی مل گئی تھی لیکن کچھ لوگ زیادہ عرصہ تک رہے اور ان کے لئے یہ انٹرویو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جو انھیں اپنی اس کس مپرسی کی حالت میں یہ یاد دلاتا تھا کہ باہر بھی ایک جہانِ قید و زنداں ہے جس میں ان کے اہل و عیال سسک رہے ہیں۔ اس انٹرویو سے اگر ایک طرف تسکین ہوتی تھی تو اسکے اختتام پر ایک احساس اذیت و کرب باقی رہ جاتا تھا جو متعلقہ افراد کو دوسرے انٹرویو تک امید و بیم کی حالت میں پریشان رکھتا تھا۔

انفرادی تباہی

لیکن یہ انٹرویو بھی لوگوں کو تباہی و بربادی سے نہ بچا سکا۔ جنھیں تباہ ہونا تھا وہ ہوئے جن کے کاروبار چوپٹ ہونا تھے ہوئے، جن کے خانگی معاملات میں الجھن پیدا ہونا تھی وہ ہوئی۔ اب گرانٹ اسٹریٹ کے حبیب صاحب ہی کو لے لیجئے۔ بہت بڑے بیوپاری تھے لیکن کس چیز کے، یہ نہ پوچھئے بہرحال بے چارے کا کاروبار عروج پر تھا بڑے آرام سے زندگی کٹ رہی تھی کہ یکایک ان کی کشتیٔ حیات اس قید و بند کے بھنور میں پھنس کر تباہ ہو گئی۔ ان کا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ بیوی الگ ہو گئی اور ایک بے چارہ مرنجان مرنج انسان آن واحد میں سب کچھ گنوا بیٹھا۔

ایک تھے ڈاکٹر عبد الشکور صاحب۔ مٹیا برج میں رہائش تھی انتہائی عزت دار انسان۔ اچھے ڈاکٹر، سوسائٹی میں مرتبہ رکھنے والے اور اس پر طرہ یہ کہ سیاست سے بالکل الگ۔ کبھی جلسہ جلوس سے دلچسپی نہ لی۔ کبھی کسی سیاسی پارٹی

میں شامل نہ ہوئے کبھی کسی امیدوار میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی ایک بھیڑ چال میں انھیں بھی جیل میں بند کردیا گیا اور انھیں اس کا خمیازہ اپنی زندگی کی تباہی کی صورت میں ملا۔

میرے بھائی

میرے بڑے بھائی یوسف صاحب کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ وہ بھی سیاست سے قطعی متنفر تھے اور صرف کاروبار کی نگرانی میں رہتے تھے اور اپنے بال بچوں میں مگن تھے کہ انھیں دوبے کی ستم ظریفی نے اس عجیب و غریب زندانِ سیاست میں لاکر رکھ دیا۔ میرے بھائی رفیق صاحب ایک خوش باش انسان۔ ایک اچھے کاروباری تعلیم یافتہ، مخیر، سخی، پیسے کو ہر آفت زدہ اور ستم ظریفی پر خرچ کرنے والے سیاست سے قطعی بے تعلق۔ لیکن انھیں بھی جیل کی چہار دیواری میں لاکر بند کردیا گیا۔ فتح دین اینڈ سنز کی انتہائی پرانی اور باعزت فرم بلیک لسٹ کردی گئی اسلئے کہ اس کے تین پارٹنر یعنی یوسف بھائی رفیق بھائی۔ اور میں جیل میں تھے۔

اپنی باتیں

مجھی کو لے لیجئے۔ کلکتہ کے لوگوں کے سامنے میری زندگی عیاں ہے کاروبار سے تھوڑی بہت دلچسپی، ورنہ اسپورٹس۔ فلموں اور تفریحات کا شوق۔ فلمی رسالے نکالنے کی لگن۔ فلم اسٹاروں سے انٹرویو لینے اور کلچرل شوز میں حصہ لینے کا خبط۔ ۱۹۶۴ء میں فسادات کے دوران ٹنگرا میں لاکھوں کی جائیداد اور کاروبار تباہ ہوگیا۔ لٹ لٹا کر چیت پور روڈ آنا پڑا۔ ابھی اس شاک سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ خطا کیا تھی۔ پہلی بار زندگی میں

سیاست میں دلچسپی لی تھی اور وہ بھی اس لئے کہ گنپت لال کھتری کونسلر کی سیٹ
کے لئے زکریا اسٹریٹ کے علاقہ سے کھڑے ہوئے تھے اور میں نے دوستی کے ناطے ان کی
حمایت کی تھی اور ان کی کامیابی میں کچھ ہاتھ میرا بھی تھا۔ شری ایشور داس جالان
نے بھی مجھ سے خواہش کی کہ میں بڑا بازار اسمبلی حلقہ میں الکشن کے دوران ان کی مدد
کروں اور جب وہ جیت گئے تو مجھے میری کارگزاریوں کی وجہ سے گلے لگا لیا اور مبارکباد
دی کہ میری کوششوں کی وجہ سے ۸۰ فیصد مسلمانوں نے انھیں ووٹ دیئے اور اس کا
صلا یہ ملا کہ کانگریسی امیدواروں کو کامیاب کرانے والا اسی "جرم" کی پاداش میں خود
کانگریسی حکومت کے ہاتھوں جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ باعث حیرت یہ امر ہے کہ ہم
لوگوں کا پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا اور سوا کلکتہ میں سوشیل سروس کرنے، مذہبی اور
کلچرل تقریبات میں شرکت کرنے اور لکھنے لکھانے اور مضامین چھپوانے کے میری
اور کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دوستوں کے حلقے میں بھی شہریار بیگ صاحب۔ ادریس فرنیچر
والے۔ ملا جان صاحب۔ اور دوسرے ایسے لوگ جو یا تو کاروباری تھے۔ یا غیر سیاسی
اور جو سیاسی تھے وہ سب کے سب کانگریس ہی سے تعلق رکھتے تھے اسکے باوجود ان
دو برسوں یعنی ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں یکے بعد دیگرے دو عظیم حادثے مجھے پیش آگئے
ٹنگرا میں میرا سب کچھ ان لوگوں نے لوٹ لیا جن سے ایسی امید نہ تھی اس علاقہ
میں بھی میں انتہائی ہر دلعزیز تھا اور کسی سے برائی نہ کی۔ لیکن فسادات کے دوران
مجھے ہی فرقہ پرستی کے ننگے ناچ کا نشانہ بنایا گیا اور ۱۹۶۵ء میں مجھے جیل میں بند
کر دیا۔ ان دو سانحوں نے مجھے جہاں ایک سبق دیا اور بعض قدروں پر دوبارہ

غور و خوض پر مجبور کیا وہاں میری زندگی کے دھارے کو بالکل بدل دیا۔ میں ایک غیر متعلق خوشباش نوجوان سے یکایک ایک ایسے فرد میں تبدیل ہو کر جیل سے نکلا جو یہ سمجھنے لگا ہو کہ زندگی کا ایک سنجیدہ مقصد ہے اور اس کی قدروں کو تجربات کی روشنی میں جانچنا ہی عقلمندی ہے۔ جذباتیت عموماً نقصان پہونچاتی ہے۔ ابن الوقتی تو خیر خمیر ہی میں نہ تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ جان لیا کہ وہی لوگ اچھے رہتے ہیں جو ابن الوقت ہوتے ہیں۔ ہم کم از کم ابن الوقت نہ بنیں تو عملی طور پر حقائق پسند ضرور بنیں۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اندھا دھند کسی دھارے میں بہہ جانا نقصان دہ بھی ہوتا ہے اور تباہ کن بھی۔ اور یہ سبق زمانے نے مجھے نہ صرف جیل سے پہلے بلکہ جیل سے نکلنے کے بعد بھی سکھایا۔ نقصان پہنچا کر سکھایا اور تلخ تجربات کے ذریعہ سکھایا۔ یہ سبق اگرچہ میں اپنی فطری جذباتیت کی وجہ سے پوری طرح سیکھ نہیں سکا اور شاید کبھی نہ سیکھ سکوں لیکن محتاط ضرور ہو گیا ہوں۔

شہریار بیگ

ایک اور حیرت انگیز قیدی کانگریس کے دورِ حکومت میں کانگریسی گورنمنٹ کے ایجنٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے شہریار بیگ صاحب بھی تھے۔ میں انھیں بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ میرے بزرگ بھی ہیں اور میرے بعض دشوار مسائل میں رہنمائی بھی کرتے رہے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری عمر خدمت خلق اور کانگریس کی حمایت میں گذری۔ ان اصولوں اور قدروں کی پاسداری میں گذری جو کانگریس پارٹی کی بنیاد ہیں اور جن سے الگ ہونے کی وجہ سے بہت سے کانگریسی خود کانگریس سے

الگ ہو گئے۔ شہریار بیگ صاحب شری بجے سنگھ نہار کے داہنے ہاتھ رہے اور بجے بابو خالص گاندھی واد کے پیرو۔ کٹر کانگریسی اور ملک و قوم کے بہترین خادم۔ شہریار بیگ صاحب نے مسلمانوں کی بہبودی اور فلاح اور کانگریس کی فتح و بقا کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ ان کو پاکستان سے نہ کوئی غرض رہی نہ ہے۔ ان کا ایک خاص حلقۂ اثر اور حلقۂ احباب ہے۔ وہ تقسیم ملک کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات میں ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار رہے اور فسادات کے دوران مظلومین کی مدد کرنے میں انھوں نے بجے بابو کے ساتھ مل کر بعض اوقات اپنی جان کی بازی لگا دی۔ بظاہر ان کی گرفتاری میں بجے بابو کے حریف شری اتولیہ گھوش کا ہاتھ تھا۔

ادریس صاحب فرنیچر والے بھی اسی گروپ کے ایک فرد تھے اور شہریار بیگ صاحب کے دوست لہٰذا ان کی گرفتاری کے پیچھے بھی یہی کچھ اسباب تھے جو بیگ صاحب کی گرفتاری کے پس منظر میں موجود تھے۔ یہ لوگ علاقہ بہو بازار میں ایک خاص اہمیت رکھتے تھے جہاں سے بجے بابو کھڑے ہوا کرتے تھے اور ان کا مسلمانوں کی ووٹنگ میں خاص ہاتھ ہوتا تھا۔ یہ بہو بازار گروپ کہلاتا تھا اور اس کا اس علاقہ میں زبردست اثر تھا۔

چاندنی گروپ

بجے بابو ہی کے علاقہ کی دو اور مقتدر ہستیاں بھی جیل کی زینت تھیں۔ ایک تو چاندنی اور ویلیسلی کے بہت بڑے زمیندار۔ کراؤن سنیما اور برابورن کورٹ کے مالک۔ محمڈن اسپورٹنگ کلب کے ایک انتہائی بااثر اور پرانے ممبر اور سرپرست۔ ہاشم صاحب تھے اور دوسرا ان کے صاحبزادے

قطب الدین صاحب (چنی صاحب) یہ دونوں اصحاب علاقہ چاندنی کی ناک اور "چاندنی گروپ" کے سربراہ تھے اور قطب الدین صاحب اب بھی اس علاقہ کی سب سے اہم شخصیت ہیں۔ یہ لوگ بھی بجے بابو کے حمایتی تھے اور کانگریس کی مدد کرتے تھے لیکن صرف اس طرح کہ سب سے با اثر یہی لوگ تھے اس علاقہ میں۔ دوسری تمام تقریبات بھی بغیر ان کے اس علاقہ میں منائے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور یہ لوگ بھی اس پورے علاقہ کے لوگوں کی ہر طرح امداد اور سرپرستی کرتے تھے۔ پاکستان سے ان کا نہ کبھی کوئی تعلق تھا نہ ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اس دور میں جبکہ یہ گرفتاریاں ہوئیں۔ کسی بھی مسلمان کا سب سے بڑا قصور یہی تھا کہ وہ کسی مسلم علاقہ میں کوئی اہمیت رکھتا ہو اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کا ہمدرد ہو۔ اس پر طرہ بجے بابو کی حمایت تھی۔ چنانچہ اتلیہ گھوش کے گرگے انھیں کہاں چھوڑنے والے تھے۔ ہاشم صاحب کو ضعیفی میں جیل میں بند کر دیا وہ یہ ذلت نہ برداشت کر سکے اور جیل سے آکر ایسے بیمار پڑے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ پی سی سین کی ڈکٹیٹر شپ کی قربان گاہ کے ایک شہید یہ بھی ہوئے۔

تانتی باغ تانتی باغ سے کئی معززین گئے ہوئے تھے۔ مثلاً سیٹھ یوسف صاحب، عنائت الرحمٰن صاحب، نظام الدین صاحب، شہاب لکھنوی، اقبال اعظمی، سیٹھ یوسف کے بھتیجے صلاح الدین صاحبان وغیرہ۔ سیٹھ یوسف صاحب بھی پی سی سین کی الٹی سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے اور جیل سے آنے کے بعد اپنی اس ہتک کو انھوں نے قبر کے پردے میں ہمیشہ

کے لئے چھپایا۔ وہ سابق میور کلکتہ اور سابق ایم ایل اے نرلش ناتھ مکرجی کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور تانتی باغ کے علاقہ میں زبردست اثر رکھتے تھے صاحب دولت و ثروت بھی تھے۔ ان کی گرفتاری بھی ایک عجیب و غریب چیز تھی۔ اسلئے کہ وہ ایک تو اپنے علاقہ میں کانگریس کے ایک بڑے ستون سمجھے جاتے تھے اور دوسرا انھیں بھی پاکستان سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کا سارا خاندان ہی ہندوستان میں تھا۔ بردوئی پور میں ان کی بہت بڑی جائداد ہے۔

عنایت الرحمٰن صاحب بھی اپنے علاقہ کے بہت بڑے کاروباری ہیں۔ محمڈن اسپورٹنگ کلب کے دیرینہ سرپرستوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور ہزاروں روپے ماہوار کا خرچ ان کے اس شوق پر ہوتا تھا۔ ان کا بھی سب کچھ ہندوستان ہی میں ہے۔ بہت بڑا پریس اور جائیداد ہے۔ قوم و ملت کے ہمدرد جیل میں بھی داد و دہش کا یہ سلسلہ خاموشی سے جاری رہا اور بہت سے ضرورت مندوں کی مالی امداد کی بہت لوگوں کے گھروں کی نگہداشت کی اور جیل میں کپڑے وغیرہ تقسیم کئے لیکن یہ سب کچھ بغیر کسی دکھاوے یا پبلسٹی کے کیا۔ جیل سے چھوٹ کر ان کی صحت بھی تباہ ہو گئی اور اب تک وہ بہتر نہ ہو سکی۔

نظام الدین جو فی الحال اس علاقہ کے ایم ایل اے ہیں جیل جاتے وقت ایک نوجوان سیاسی ورکر تھے ان کا بھی اس علاقہ میں بڑا اثر تھا اور اب بھی ہے کارپوریشن کے الکشن میں بھی حصہ لیا تھا۔ ان کا بھی پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا اور اب تک دو بار ایم ایل اے ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر غنی کو اس علاقہ سے ہرانا اس

نوجوان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

قاضی الماس

جب عنایت الرحمٰن صاحب کا ذکر آیا ہے تو قاضی الماس صا کا بھی ذکر ہونا چاہیے جو کوہِ نور جیسے عظیم الشان پریس کے مالک تھے، توپسیا میں ان کی سینکڑوں بیگھہ زمین اور ایک اور پریس تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے انھوں نے پنڈت نہرو کے "ہون" میں جو کلکتہ میدان میں ہوا پورا خرچ برداشت کیا تھا۔ ان کی خدمات سے خوش ہو کر کانگریس پارٹی نے انھیں ۶۵ء ہی میں کلکتہ کارپوریشن کا آلڈرمین بنا دیا تھا اور انھوں نے اس خوشی میں اپنی گرفتاری سے صرف چند روز پہلے لاکھ روپے سے زیادہ ہندوستان کے ڈیفنس فنڈ میں دیئے تھے لہٰذا ان کے جیل جانے کا یعنی پاکستان نواز ہونے کا سوال ہی پیدا ہونا چاہیے تھا لیکن پی سی سین کی اندھے کی لاٹھی نے انھیں بھی نہ چھوڑا اور جیل کی ہوا کھلا دی۔ جیل سے نکلنے کے بعد ان کے کئی بڑے بڑے چھپائی کے معاہدے ختم ہو گئے اور انھوں نے صحت اور کاروبار کے معاملے میں ایسا صدمہ اٹھایا کہ آج تک سنبھل نہ سکے۔

دوسرے کاروباری

ایسے درجنوں اور کاروباری جیل میں بند تھے کس کس کا ذکر کیا جائے جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہے ذکر کیا جا رہا ہے۔ فضل رب موٹرس کے پروپرائٹر بھی ان میں شامل تھے ان کا بہت بڑا کاروبار بیک بنگال میں پھیلا ہوا تھا انھیں بھی جیل میں بند کر دیا گیا وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ اس جھوٹے الزام کو سچ کر دکھایا اور کارو

اپنے دوسرا عزار کے حوالہ کر کے پاکستان چلے گئے۔

عبد الخالق صاحب اور غفار صاحب

کلکتہ میں ایک بہت بڑی ٹرانسپورٹ کی فرم ہے جو انٹالی اور خضر پور کے دو مراکز سے کام کرتی ہے اس کا نام ہے۔ "جی آزاد ہند ٹرانسپورٹ" اسکے مالک ہیں عبد الخالق صاحب اور ان کے بھائی غفار صاحب۔ ان لوگوں کو سوا اپنے کاروبار کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں۔ پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ان بے چاروں کو بھی بند کر دیا گیا اور خالق صاحب کی حالت تو جیل میں خاص طور پر بہت بری تھی۔ کئی مرتبہ روتے ہوئے دیکھا گیا اور ساتھیوں نے جہاں تک ہو سکا ہمت افزائی کی لیکن یہ صدمہ بہر حال انتہائی سنگین تھا اور جیل سے چھوٹنے کے بعد دونوں بھائیوں نے کلکتہ کی گہما گہمی سے اور زیادہ علحدگی اختیار کر لی۔

ان گوشہ نشینوں میں خاص طور پر نام شوکت پنجابی (پھول لیگان) کا آنا چاہیے جو جیل میں جب تک رہے انتہائی نروس رہے اور رہائی کے بعد ایسے اپنے کام میں ڈوبے کہ دنیا و ما فیہا سے الگ چمڑے کی دنیا میں جیسے گم ہو کر رہ گئے۔ ان کے بغل میں کچھ گرم گرم مباحثہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن انھوں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ ہوا یہ کہ جیسے کچھ بنگالی بھائی مولانا غلام علی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ذکر اذکار کرتے تھے اسی طرح دوسرے کمروں میں بھی دینی معاملات پر بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا۔

مولانا عطاء الرحمٰن

اس بحث میں مولانا عطاء الرحمٰن قدسی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ قادیانی اور غیر قادیانی عقیدے کی یہ بحث انتہائی دوستانہ فضا میں ہوتی تھی اور مولانا موصوف جو عصر جدید کے ایڈیٹر تھے اور اس اخبار کے ایک مخصوص کالم "ارشادات نبوی" کے مؤلف بھی تھے۔ خاص طور پر اس سلسلہ میں انتہائی سرگرم نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے جو فکر افکار میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

اخبار والے

۶۵ء میں کلکتہ سے چھ اخبار روزانہ نکلتے تھے۔ آزاد ہند۔ عصر جدید۔ روزانہ ہند۔ آبشار۔ امروز اور غازی۔ اس سلسلے میں یہ امر باعث حیرت ہے کہ کچھ اخبارات کے قریب قریب سارے لوگ پکڑے گئے اور باقی کورے بچ گئے۔

سب سے عجیب واقعہ عصر جدید اور امروز کا ہے۔ عصر جدید اور امروز دونوں خان بہادر محمد جان صاحب کی ملکیت تھے اور ہیں۔ اس وقت عصر جدید کے ایڈیٹر مولانا عطاء الرحمٰن قدسی تھے اور جوائنٹ ایڈیٹر شہاب لکھنوی امروز کے ایڈیٹر اقبال اکرامی تھے۔ منیجر قاضی اقبال احمد تھے۔ یہ سب کے سب گرفتار ہو گئے اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ خود خان بہادر صاحب بچ گئے حالانکہ یہ ان اخبارات کے مالک تھے اور پاکستان میں ان کی صاحبزادی کی شادی بھی ہوئی۔

غازی کے ایڈیٹر وقار مشرقی گرفتار ہوئے اور خادم قوم ملا جان صاحب کے

ساتھ پریسی ڈنسی جیل میں رکھے گئے۔ آزاد ہند سے صرف رئیس جعفری صاحب کو گرفتار کیا گیا اور روزنامہ ہند اور آبشار کا پورا اسٹاف بچ گیا۔ کسی کو چھوا تک نہیں گیا۔ بنگلہ اخبار پیغام کے ایڈیٹر اور مالک غوث الانام صاحب بھی ہمارے ساتھ جیل میں تھے اور سید بدرالدجیٰ صاحب اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سب سے آخر میں رہا کئے گئے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت ہند کی جو پالیسی ان گرفتاریوں کے سلسلے میں بنائی گئی تھی اس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ بادی النظر میں نہ ان گرفتاریوں کی کوئی بنیاد سمجھ میں آتی ہے نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لائحہ عمل کن اصولوں پر تیار کیا گیا تھا۔ اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ گرفتاریاں اندھے کی لاٹھی معلوم ہوتی ہیں جدھر چل گئی چل گئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نہیں ایک خاص اصول پیش نظر تھا جو لوگ حکومت کی نظروں میں خطرناک تھے ان کا گرفتار ہونا تو ناگزیر تھا جو لوگ دو بے اور اس کے ساتھیوں کی بغض و عناد سے بھری ہوئی رپورٹوں کی بنیاد پر حکومت کی نگاہوں میں خطرناک ہو سکتے تھے انھیں بھی بند کر دیا گیا۔ صرف ان لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا جن کے متعلق یا تو رپورٹ اچھی تھی یا حکومت انھیں "بے ضرر" سمجھتی تھی ان میں اسکے "اپنے آدمی" بھی شامل تھے۔

شیخ اکبر علی صاحب

ایک اور کلکتہ کی مشہور شخصیت شیخ اکبر علی صاحب کی تھی جو مہدی لگان، رپن اسٹریٹ وغیرہ ایک بڑے مسلم علاقہ کے قریب قریب مختار کل تھے اور ہیں۔ ان کی دریا دلی سخاوت اور داد و دہش

سے نہ صرف یہ کہ کلکتہ بلکہ ہمارے ہندوستان کے مسلم تعلیمی اور خیراتی ادارے مستفید ہوتے ہیں۔ اور اپنے علاقہ میں تو یہ "اکبر بادشاہ" ہی مشہور رہیں اور سمجھے جاتے ہیں حتیٰ کہ ملا جان محمد صاحب مرحوم بھی انھیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ اکبر صاحب بھی اپنے علاقہ میں کانگریس اور خصوصاً بچے بابو کے حمایتی تھے اگر پاکستان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا اور سب کچھ ساری جائیداد اور کاروبار کلکتہ ہی میں ہے لیکن انھیں بھی ۲ بجے رات کو اٹھا لیا گیا۔ اکبر صاحب ۱۹ کمرہ میں مقیم تھے اور کافی عرصہ کے بعد انھیں رہائی ملی جیل میں بھی ان کی خاموش سخاوت جاری رہی۔

مہدی بگان ان کے ساتھ مہدی بگان کے سابق ایم ایل اے اور ایک مشہور ترین ہستی میاں شمس الحق (گاڑی والے) کے صاحبزادے لعل میاں بھی جیل میں تھے اور اس محلے کی دوسری قابل ذکر ہستی ہاتف القادری صاحب کی تھی جو انتقال فرما گئے ہیں۔ ہاتف صاحب ایک کہنہ مشق شاعر اور مقرر تھے۔ ساتھ ساتھ سیاست سے بھی شغف تھا اور کرم حسین صاحب ایم ایل اے اور کانگریس پارٹی کے بڑے سرگرم ورکر تھے۔ ان کو ان کی مکمل وفاداری کا صلہ یہ ملا کہ انھیں بھی ڈیڑھ ماہ جیل میں سڑا دیا گیا اور وہاں سے آکر تھوڑے عرصہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اسی علاقہ کے ایک اور سرگرم سوشل کارکن شاکر حسین صاحب بھی جیل سے آکر زیادہ دن نہ بچے اور انتقال فرما گئے۔ جیل جانے والوں میں حبیب صاحب بھی تھے جو اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اب تک جیل کی خوفناک زندگی کی یاد لئے زندہ و سلامت موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ابو حفیظ محمد اسمٰعیل کولنعلر بھی تھے جن کا ذکر

کونسلروں کے ساتھ آئے گا۔

جان نگر روڈ

پارک سرکس کا ایک علاقہ، جان نگر روڈ۔ اس علاقہ سے مجموعی طور پر اور اوسطاً سب سے زیادہ لوگ گرفتار ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف یہ کہ یہ علاقہ کانگریس کا ۱۹۶۴ء سے پہلے تھا بلکہ اس نے ۱۹۶۵ء میں کانگریس سے بغاوت کردی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جب کارپوریشن کے وارڈوں کی نئی حد بندی ہوئی تو اس علاقہ کے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ اس علاقہ میں مسلم ووٹر زیادہ ہیں لہٰذا یہاں سے ۱۹۶۵ء کے کارپوریشن الکشن میں ایک مسلم امیدوار دیا جائے۔ لیکن اس علاقہ کی دو بڑی پارٹیوں کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی نے ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا اور دونوں نے مسلم امیدوار نہ دیئے۔ اس علاقہ کے لوگوں نے احتجاج کے طور پر محمد علی شہاب لکھنوی کو جنھیں کانگریس پارٹی نے ۱۹۶۴ء میں مسلم فساد زدگان کی حمایت کے سلسلے میں معطل کر دیا تھا۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا اور جتا دیا۔

اکرم حسین

چنانچہ اس علاقہ کے جس قدر با اثر لوگ تھے سبھوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا جن میں سب سے پہلے تو شہاب لکھنوی ہی تھے جو بنائے فساد تھے ساتھ ساتھ ان کے حمایتی جناب اکرم حسین صاحب جو کلکتہ کارپوریشن کے ایک اہم عہدہ دار، محمڈن اسپورٹنگ کے سرگرم سرپرست، اپنے علاقہ کی ناک پارک سرکس سبھا کے روح رواں، اس علاقہ میں ملّا جان صاحب کے خاص نمائندہ اور عام طور پر انتہائی سرگرم کارکن تھے جیل میں بند کر دیئے گئے ان کو پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کا سب کچھ جان نگر روڈ کی ایک گلی میں ہے لیکن ان کا یہ گناہ کیا کم تھا کہ کانگریسی ہوتے مسلم دوستی میں اس سے بغاوت کردی تھی۔

ان کے ساتھ عبدالباری صاحب، عیدگاہ گلی کے ایک مقتدر لیڈر رحیم صاحب جمال صاحب پیارو صاحب، جان محمد صاحب، وغیرہ درجنوں افراد جیل گئے اور سینہ تان کر گئے۔

خواجہ محمد یوسف

لیکن ایک شخص کی گرفتاری کی وجہ سمجھ میں نہ آئی اور وہ تھے خواجہ محمد یوسف صاحب ایڈوکیٹ، اہل قلم، کلکتہ کے سارے انگریزی روزناموں میں اسلامی مسائل پر مضامین لکھنے والے ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن، ایران سوسائٹی کے ممبر کلکتہ کے اہل علم مسلم حضرات میں ایک خاص مقام رکھنے والے اور سیاست یا پاکستان سے بالکل بے تعلق۔

یہ ادبی انسان جسے صرف اپنے پیشے عدالت، اور لکھنے لکھانے سے کام تھا کیسے ڈوبے اینڈ کمپنی کی فہرست میں آگیا یہ ہمارے لئے اب تک باعث حیرت ہے

بیک بگان

یہ علاقہ بھی حکام کی نظر سے نہ بچ سکا۔ جب اس علاقہ کا ذکر آتا ہے تو ڈاکٹر جہانگیر عالم کا نام فوراً ذہن میں آجاتا ہے جو اس علاقہ کے بڑے پرجوش ملی کارکن تھے اور یوں ان کا جیل جانا تو تقریباً یقینی تھا۔ لیکن جال میں دوسری مچھلیاں بھی چھوٹی بڑی کھینچ لی گئیں ڈاکٹر صاحب کا جیل جانا اس لئے یقینی نہیں تھا کہ انہیں پاکستان سے کوئی لگاؤ تھا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ بھی مسلم سیاست میں ملوث تھے اور مسلمانوں کا ساتھ دیتے تھے۔

ان کے ساتھ جیسے اسلام صاحب ایڈوکیٹ، اشتیاق حسین وکیل، زین العابدین انجینئر، محمد طاہر (ٹارزن) جو چار روز بعد دفتر سے گرفتار کرکے لائے گئے، عبدالغفار، محمد لقمان اپنے علاقہ کے سرگرم کارکن یہ سب کے سب گرفتار کرکے لائے گئے۔ برکت علی اینڈ

سنز مشہور ٹیلرنگ کمپنی کے محمد صدیق صاحب بھی گرفتار تھے۔ اور ان کے ساتھ کئی اور اصحاب بھی آئے۔ حتیٰ کہ بیک بگان شمس الہدیٰ روڈ، برانٹ اسٹریٹ، دلکشا اسٹریٹ وغیرہ علاقے بالکل سنسان اور غیر محفوظ رہ گئے، کم و بیش پارک سرکس کا پورا علاقہ ان اجتماعی گرفتاریوں کے زیر اثر آگیا۔

راجہ بازار

راجہ بازار سے بھی کافی لوگ گرفتار کئے گئے۔ ان کا بھی قصور یہ تھا کہ انہوں نے کانگریس سے ایک اور معطل شدہ ماسٹر شمس الضحیٰ صاحب کو کونسلر کے الکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا اور جتا دیا لیکن یہ لوگ جیل جانے کے بعد بھی ڈرے نہیں اور ضحیٰ صاحب کو جیل سے واپس آکر ایم ایل اے بنا دیا۔ ضحیٰ صاحب بھی ملا جان صاحب کے دست راست تھے۔

رضی صاحب اور ابوبکر صاحب

ضحیٰ صاحب کے ساتھ جیل جانے والوں میں خاص طور پر الیس ایم ابوبکر صاحب کا ذکر ضروری ہے جو پاکستان سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے لیکن مسلم سوشیل ورک کے لئے مشہور ہیں۔ انہیں سیاست سے برائے سیاست کوئی دلچسپی نہیں۔ لہٰذا ان کی گرفتاری بھی بادی النظر میں حیرت انگیز تھی لیکن جب راجہ بازار کی جائے وقوع اور وہاں کے مسلم عوام کی بے جگری اور کارناموں کی طرف دھیان جاتا ہے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ واقعی یہاں سے گرفتاریاں ہونا ضروری تھیں چنانچہ رضی الرحمٰن صاحب رضی کانگریس کے بہت بڑے ستون اور نارکل ڈانگہ کے ایک سرگرم ورکر بھی جیل میں تشریف لے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ اور متعدد لوگ بھی جیل میں تھے اور اس علاقہ کو بھی گرفتاریوں کے ذریعہ مفلوج کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

خضر پور اور مٹیا برج

ان دو علاقوں سے بھی متعدد اصحاب جیل گئے لیکن موجب حیرت یہ امر ہے کہ اس علاقہ کی جو لوگ ناک سمجھے جاتے تھے جن کی شعلہ بیانی سے حکومت کو خطرہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ آزاد رہے۔ یہ جنت مکانی سلیمان نہر صاحب کے الفاظ میں جو خضر پور کی مقتدر علمی و ادبی ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے، اور خود بھی صاحب حیثیت تھے۔ انھیں نہ سیاست سے کوئی لگاؤ تھا نہ پاکستان سے کوئی تعلق لیکن انھیں پکڑ کر جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ انھیں یہ حیرت تھی کہ کرے داڑھی والا، اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ حضرت نہر کو اپنی اس گرفتاری کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ جیل سے آکر زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے اور ایسے بیمار پڑے کہ جانبر نہ ہو سکے۔

ایک اور گرفتاری خضر پور سے ناظم علی مرزا نبیرۂ واجد علی شاہ کی تھی آپ پرنس یوسف صاحب کے داماد تھے لہٰذا پرنس یوسف صاحب کے پاکستان جانے کے بعد ایک جواز ان کی گرفتاری کا ملتا تو ہے لیکن بڑی دور کی کوڑی ہے۔ خود انھیں نہ کبھی سیاست سے دلچسپی رہی نہ پاکستان سے کوئی لگاؤ رہا۔

مٹیا برج سے کئی ڈاکٹر اور دوسرے باثر سوشیل کارکن بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کی تفصیل باوجود انتہائی کوششوں کے معلوم نہ ہو سکی۔

خضر پور کے گرفتار شدگان میں خاص طور پر دو ہستیوں کے نام قابل ذکر ہیں ایک تو "ساج گھر" کے مالک ابوالکلام صاحب جو اس علاقہ کے بعض انتہائی با اثر لوگوں کے معتوب تھے اور ہیں۔ ان کا بھی پاکستان یا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن غالباً سرکار کے "اپنے آدمیوں" کی دشمنی کے بھینٹ چڑھ گئے اور دوسرے تھے صلاح الدین صاحب یہ بھی معتوبین کی فہرست میں تھے

لہٰذا انھیں بھی آزاد رہنے والوں نے جیل بھیج کر کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

چیت پور کلکتہ میں سب سے بڑا گروپ چیت پور سے گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چیت پور کا علاقہ ملاجان صاحب خادم قوم کی خلافت کمیٹی کا ہیڈ کوارٹر اور ان کی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا۔ ویسے تو کلکتہ کیا مغربی بنگال اور ہندستان کے بیشتر علاقوں کے لوگ علی برادران کے اس بوڑھے سپہ سالار کی آواز پر لبیک کہتا تھا جیسا کہ لکھنؤ کے پہلے مجلس مشاورت کے جلسے نے ۱۹۶۵ء میں ثابت کردیا لیکن اس علاقہ کے لوگ ملاجی پر جان دیتے تھے اور ان کے ایک اشارے پر دامے درمے قدمے سخنے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے۔

ویسے بھی یہ علاقہ کلکتہ کی ناک سمجھا جاتا ہے اور اب بھی مسجد ناخدا کے سامنے نماز مغرب سے نماز عشا تک ۲۰ ہزار افراد کا مجمع موجود رہتا ہے۔ زکریا اسٹریٹ اب بھی مسلمانوں کی سماجی اور مجلس زندگی کا مرکز ہے۔ اگرچہ اس علاقہ کی مسلم آبادی دن بدن کم ہوتی جاتی ہے۔ اور اب وہ استحکام باقی نہ رہا جو پہلے تھا۔ لیکن چیت پور روڈ یا رابندر سرانی کو اب بھی مسلم کاروباریوں کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلئے کہ اس راستے پر ہیرسن روڈ سے لیکر ٹرہٹی بازار تک مسلمان تاجروں کی ٹھوس اکثریت ہے جو کیننگ اسٹریٹ، زکریا اسٹریٹ یا کولوٹولہ اسٹریٹ میں مقابلتاً باقی نہیں رہی۔

چیت پور گروپ میں گرفتار شدگان کے ناموں میں خاص طور پر قابل ذکر ہستیاں مندرجہ ذیل ہیں۔ ایک تو محمد یوسف صاحب (آزاد بوٹ ہاؤس) دوسرے محمد شفیع صاحب (عمر برادرس) اور تیسرے عمر صاحب (سنٹرل ربر ورکس)۔ یوسف صاحب اپنے کاروبار سے کام رکھنے والے مرنجان مرنج ایک شریف انسان، نہ سیاست سے لگاؤ نہ پاکستان سے واسطہ۔ اس طرح خدمت

خلق کرنا کہ ایک ہاتھ سے دینا اور دوسرے کو خبر تک نہ ہوئی ان کو خواہ مخواہ پکڑ کر بند کر دیا گیا اور ان کا نہ صرف یہ کہ لاکھوں کا نقصان ہو گیا بلکہ ایسے جھمیلے کھڑے ہو گئے کہ وہ برسوں نہ سنبھل سکے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود انہوں نے جیل میں بھی سب تکلیف بہ خندہ پیشانی برداشت کی اور داد و دہش کا خاموش سلسلہ وہاں بھی جاری رکھا۔ شفیع صاحب چیت پور رروڈ کے عین وسط میں گول کوٹھی امام باڑہ کے سامنے ایک فرم عمر برادرس کے مالک ہیں۔ یہ بھی خالص کاروباری انسان، دوستوں کے دوست مسلمانوں کا درد دل میں رکھنے والے لیکن سیاست سے بالکل الگ پاکستان سے بالکل بے تعلق۔ اپنے طور پر خدمت خلق کے رسیا۔ خاموشی سے جیل میں بھی ان لوگوں کی امداد کرتے رہے جو سخت مشکلات میں گرفتار تھے۔ عمر صاحب مالک سنٹرل ربر ورکس بھی ہمارے ساتھ تھے اور مولانا عطاء الرحمٰن صاحب کے ساتھ ان کے مباحثے بڑے دلچسپ رہتے تھے۔ انہیں لوگوں کے ساتھ سلیمان وو ڈا صاحب، ملاجان صاحب کے ساتھی اور خزانچی بھی موجود تھے۔

اس علاقہ کا گروپ بہت بڑا تھا۔ میرے، بھائی رفیق اور بھائی یوسف کے علاوہ متعدد افراد اس میں شامل تھے ان میں سے بیشتر کا ذکر آچکا ہے بعض کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس وقت جو نام ذہن میں ہیں ان کا ذکر کرتے چلیں۔ کوثر صاحب اور حامد صاحب کا ذکر ہوٹل والوں کے ساتھ آئے گا جن میں حسن امام صاحب (صابرس) بھی شامل ہوں گے۔ تاج محمد صاحب کا ذکر بار بار آچکا ہے اور جیل میں ان کی مخلصانہ سرگرمیاں ہم سب کو تازندگی یاد رہیں گی۔ ان سے ہی قریب ڈاکٹر ظفر سرکار کیلا بگان کے آخری سرے پر مع اپنی اورینٹل ڈسپنسری کے موجود ہیں یہ بھی جیل کی رونق تھے اور اپنے اشتہارات کی طرح صحت کا بہترین نمونہ۔ یہ بے چارے بھی کانگریس کے حمایتی تھے اور مسلمانوں کے ہمدرد اسلئے دھرے گئے چونکہ پہلا اتفاق تھا جیل جانے کا

اس لئے انتہائی نروس رہے وہ ایک دن ۔اس کے بعد پھر کھیل اور اسپورٹس آرگنائز کرنے لگے۔

قمر ملک بار والے قمر صاحب بھی پکڑے گئے تھے ۔لیکن کیوں یہ سمجھ میں نہ آیا۔اس وقت ان کی کوئی سرگرمی سوا شام سے رات تک دودھ کڑھاؤ پر بیٹھنے کے سامنے نہ آئی تھی لیکن انہیں بھی جیل میں بند کر دیا۔بالکل اسی طرح جیسے شفاء الملک حکیم نثار احمد صاحب کو قید کیا گیا اور ان کے ساتھ ان کے اسسٹنٹ مولانا عبدالرفیع صاحب گیاوی کو بھی نظر بند کر دیا گیا

دو میمن حضرات بھی جیل میں ہمارے ساتھ تھے۔یہ بھی ایک حیرت انگیز بات تھی یہ فرقہ خالص کاروباری ہے اور کبھی اسے نہ سیاست سے دلچسپی رہتی ہے نہ سوا اس ملک کے کسی اور ملک سے جس میں وہ بزنس کر رہا ہے ۔یہ لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں ہیں وہاں کے وفادار شہری ہیں۔اس وجہ سے ہمیں عبدالکریم نور محمد صاحب اور خیسانی صاحب کو دیکھ کر حیرت ہوئی جو خالص بزنس مین ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مگن ہیں۔

ہاں ایک میمن البتہ ایسے گرفتار ہوئے تھے جو حکومت کی نگاہ میں مجرم ہو سکتے تھے اس لئے کہ وہ مسلم ویلفیئر سوسائٹی کے بانیان میں سے ایک ہیں اور انہوں نے بہ نگاہ سرکار غریب مسلم طالب علموں کی فیس اور کتابوں کے بندوبست کا ایک ادارہ کھول کر انتہائی سنگین جرم کیا تھا۔یہ تھے عبدالرزاق صاحب ایڈوکیٹ سوشیل ورکر اور مسلمانان کلکتہ کے ہمدرد اور ہم ان کا جرم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

ایک اور عجیب و غریب گرفتاری مشکور صاحب کی تھی جو کاسٹ اکاؤنٹنٹ ہیں اور اس وقت غالباً ڈپٹی فائننس منیجر گورنمنٹ آف انڈیا ہیں یہ صاحب موصوف گرفتاری کے وقت

ٹریننگ میں تھے اور دھرلیے گئے لیکن ان کا فرد جرم اس قدر بے داغ تھا کہ انہیں گورنمنٹ آف انڈیا نے بعد میں اس قدر جلیل القدر عہدے پر مقرر کیا۔ اس طرح ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ گرفتار شدگان سب کے سب اسی طرح حکومت اور افسر شاہی کی ستم ظریفی کے شکار تھے۔ یہ گرفتاریاں سراسر ظلم تھیں اور اس کا جواز خود ظالم یعنی پی سی سین کے پاس بھی نہیں تھا

حاجی غلام رسول صاحب

چونا گلی سے حاجی غلام رسول صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ آپ تبلیغی جماعت کے امیر اور کلکتہ کے بیشتر اداروں سے منسلک ہیں۔ انجمن مفیدالاسلام کے فی الحال ایگزیکیوٹیو آفیسر ہیں اور ان کے توسط سے کلکتہ سے سارے ہندستان کے دینی اداروں کو لاکھوں روپے ہر سال زکوٰۃ و فطرہ کے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالفتاح

ان کے ساتھ مولانا ابوالفتاح امیر جماعت اسلامی مغربی بنگال بھی جیل میں مع اپنے چند ساتھیوں کے موجود تھے اور حاجی غلام رسول صاحب کے بغل کے چند کمروں میں مقیم تھے۔ مولانائے موصوف کو آخری بیچ میں بدرالدجیٰ صاحب کے ساتھ رہائی ملی۔

مولانا غلام علی

ان کے ہی ساتھ مولانا غلام علی (مگراہاٹ) بھی اوپر کے کمروں میں تشریف رکھتے تھے ان کے ساتھ حاجی جے نگر اور قاضی عیسیٰ وغیرہ کئی اور اصحاب ۲۴ پرگنہ سے گرفتار ہو کر آئے۔ اگرچہ مولانائے موصوف کا پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن دینی اجتماع اور زبردست کانفرنسوں کے لئے آپ بہت زیادہ مشہور تھے انہوں نے اپنے علاقہ میں کئی بڑے بڑے اجتماع عالموں کے کئے۔ مگراہاٹ اور اطراف کے علاقوں میں ان کے آٹھ لاکھ مرید بتائے جاتے ہیں۔ خود ایک معمولی لکڑی کا گولہ" چلاتے ہیں لیکن

انتہائی بااثر اور دینی لحاظ سے بااثر ہستی ہیں۔

باعث حیرت یہ امر ہے کہ انہیں کے علاقہ کے ایم ایل اے آر دہند دشیکھر نسکر گرفتاری کے وقت وزیر پولس تھے اور انہیں بقول ان کے مولانائے موصوف کی گرفتاری کی خبر نہ تھی اگرچہ مولانا پہلے ہی گروپ میں چھوٹ گئے لیکن موگراہاٹ سے مسٹر نسکر کو بھاگ کر بلیا گھنٹہ میں پناہ لینا پڑی۔

ہوٹل والے

کلکتہ میں ہوٹل والے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر ہی عام مسلمان ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرتا ہے۔ یہ لوگ عموماً صاحب ثروت و دولت ہیں۔ ان میں بعض تو صاحبان خیر ہیں اور بعض اپنے حال میں مگن ہیں بہرحال کلکتہ میں جو بڑے بڑے ہوٹل ہیں ان میں سے بیشتر کے مالکان یا کارکنان جیل میں تھے۔ حالانکہ ان کے جیل جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی ان میں سے کوئی بھی سیاست میں ملوث نہ تھا انکی گرفتاری بھی ایک معمہ تھی جو نہ سمجھنے کا تھا نہ سمجھانے کا۔

حاجی عبدالقیوم

ان میں سب سے مشہور اور شوشیل ورک میں حصہ لینے والے حاجی عبدالقیوم صاحب تھے۔ اور ہیں۔ یہ انجمن گرلس اسکول کے چیرمین (غالباً تا زندگی) ہیں یتیم خانہ، اسلامیہ ہسپتال غرض ہر جگہ موجود ہیں، شاعری بھی ماشاء اللہ کر لیتے ہیں اور بڑے دلچسپ انداز میں سناتے ہیں، جیل میں بھی شاعری کی تبلیغی جماعت سے بھی حاجی غلام رسول صاحب کی وجہ سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔ بڑے زندہ دل آدمی ہیں لیکن حقیقت پر خاص طور پر نظر رکھتے ہیں کہ اپنا فائدہ کس بات میں ہے جیل میں بھی اس کا خاص خیال رکھا۔ ایک تجویز رکھی گئی تھی کہ کیوں نہ کھانا ہوٹلوں سے آئے اور ہوٹل والوں کو بعد

میں اس کا حساب چکا دیا جائے اس طرح جو لوگ غریب ہیں وہ بھی اچھا کھانا کھا سکیں گے جو مخیر حضرات جیل میں تھے انہوں نے ان ہوٹلوں کے بلوں کی ادائیگی کا بھی ذمہ لے لیا تھا اور دوسرے ہوٹل والے بھی راضی تھے لیکن حاجی صاحب موصوف کے اعتراض پر یہ معاملہ ختم ہوگیا۔

امین صاحب مالک امینیہ ہوٹل زکریا اسٹریٹ اس کے بالکل برعکس ایک پرعزم جوشیلے نوجوان تھے جن کے دل میں ملت کا درد تھا اور ہے۔ انہوں نے وہاں بھی جو کچھ ہو سکا غریب نظربندوں کے لئے کیا اور جیل سے نکل کر بھی کیا۔ ان کا بھی پاکستان سے کوئی لگاؤ کبھی نہ تھا اور نہ سیاست سے انہیں کبھی دلچسپی رہی نہ ہے

حسن امام صاحب منیجر صابرس ہوٹل چاندنی بھی ایک مرنجان مرنج انسان ایک اچھے دوست، سیاست سے غیر متعلق بلکہ نابلد۔ اپنے ہوٹل کی فلاح وبہبود میں غرق۔ ان کو نہ معلوم کیوں قید کیا گیا۔ سوا اس کے کوئی وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی کہ صابرس میں شاید کسی بیرے نے دو بے کو روٹی ٹھنڈی لاکر دے دی ہوگی۔

مختار صاحب منیجر سوسائٹی ہوٹل (پارک سرکس) جو اب مکھنو ہوٹل ہوگیا ہے ان کی گرفتاری بھی اسلئے کہ حیرت انگیز ہے کہ انہیں بھی سیاست سے یا پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بھی گرفتاری کے وقت سوسائٹی ہوٹل کی ہڑتال سے پریشان تھے اس لئے کہ حافظ جی گوشت والے نے جو اس ہوٹل کے مالک ہیں انھیں ہی اس ہڑتال کو ختم کرنے اور ہوٹل کو دوبارہ کھولنے کی ذمہ داری سپرد کی تھی اور اس دوران یہ زخمی ہو کر ہسپتال بھی گئے تھے۔ ہسپتال سے آتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا اور اتنے روز رکھا گیا کہ قریب قریب آخری گروپ میں ان

کو رہائی ہوئی۔ یہ بھی بقید حیات نہیں اور اسی گرفتاری کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گئے

رہے کوثر اور حامد صاحبان مالکان امجدیہ ہوٹل جو اگرچہ گرفتاری کے وقت امجدیہ پر قابض نہ تھے لیکن مالک کہلاتے ضرور تھے ان بے چاروں کو بھی اپنے جھمیلوں سے فرصت نہ تھی، کورٹ کچہری میں مشغول در کردں کی ہڑتال کا شکار عجیب پریشانیوں میں مبتلا تھے کہ یکایک یہ آفت ان کے سروں پر آن پڑی۔ ان کے ساتھ بھی وہی چیز تھی۔ نہ سیاست سے شغف نہ پاکستان سے تعلق۔ شاید دوبے سے یا اس کے کسی دوست سے کبھی کی دشمنی رہی ہوگی جو نکال لی گئی۔ بظاہر تو اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

علاقہ وار اس طرح جہاں تک ہوسکے ہم چاہتے ہیں کہ قید ہونے والوں کا تعارف عوام سے کرا دیں اور ساتھ ساتھ یہ کتاب ایک تاریخی اور حقائقی دستاویز بھی بن جائے تاکہ وہ لوگ جو گرفتار ہوئے تھے صرف اپنی اس ایک بار کی گرفتاری کی وجہ سے حکام کی نگاہ میں آئندہ مشکوک نہ رہیں۔ کیونکہ ریکارڈ اپنی جگہ رہتے ہیں اور آفیسر بدلتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی منچلا نیا ناتجربہ کار آفیسر آکر دیکھے کہ اتنے سارے ـ مشکوک، افراد آزاد پھر رہے ہیں اور ان کو دوبارہ زیر نگرانی لانے کے لئے کوئی اور کام کرنا چاہے اس صورت میں۔ زیر نظر کتاب کی ایک خاص اہمیت ہوجاتی ہے جو ہمارا ارادہ ہے کہ تمام متعلقہ محکمہ جات کو بھیج کر کسی آئندہ غلط فہمی اور غلط اقدام کا سدباب کر دیں تاکہ یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔

بات چیت پر پہرہ

مختلف محلوں سے جو لوگ گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری کی تفصیلات اور ان کے سماجی کردار کی جھلک دکھانے کے ساتھ ساتھ ہم چاہتے ہیں کہ مختلف اوقات میں دیدہ دانستہ جو تشدد اور غیر انسانی رویہ نظر بندوں کے ساتھ اختیار کیا گیا اس کا ذکر بھی کرتے چلیں۔

انٹرویو

مثلاً انٹرویو کے دوران حکام جیل کے رویہ کو ہی لے لیجئے۔ حالانکہ گورنمنٹ کی اجازت سے یہ انٹرویو ہو رہے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار یہ انٹرویو ہوتے تھے اور ان سے باتیں کرنے کا موقعہ ملتا تھا۔ جیل کے حکام بھی اس امر پر دو چار روز ہی میں متفق تھے کہ جن لوگوں کو جیل میں بند کیا گیا ہے وہ کلکتہ کی مسلم سوسائٹی کے معزز لوگ تھے اور ساتھ ساتھ ان کے کردار اور زندگی کا پس منظر بتاتا تھا کہ یہ لوگ جن کا سب کچھ ہندستان میں ہے پاکستان نوازی کے ذلیل الزام کے سلسلے میں بے گناہ ہیں۔ سوا ایک ڈپٹی جیلر کے سب آفیسر قیدیوں سے ہمدردی بھی جتاتے تھے لیکن ساتھ ساتھ وقت آنے پر ان پر سختی کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔

انٹرویو جیسا کہ ہم نے بتایا اس طرح ہوتے تھے کہ مختلف دن گروپ وار بانٹ دیئے گئے تھے جبکہ نظر بندوں کے اعزاء ان سے ملنے آتے تھے صرف بیوی اور بچوں کو ملنے کی اجازت تھی بھائی بہن بھی نہیں آسکتے تھے۔ اس وقت کا منظر بڑا دردناک اور رقت انگیز ہوتا تھا جب ایک ہفتہ کے طویل انتظار کے بعد نظر بندوں کے بیوی بچے ان سے ملنے آتے تھے اور دلوں میں نہ

معلوم کیا کچھ وہ سوچ کر آتے ہوں گے۔ ادھر قیدی ہفتہ بھر اس انتظار میں گھڑیاں گنتے تھے کب ان کے انٹرویو کا دن آئے اور وہ اپنے اہل وعیال کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں۔

اور پھر تصور کیجیے اس گھڑی کا جب ان کی یہ ساری آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہوں گی۔ کیا بے بسی تھی۔ کس قدر غیر انسانی حرکت تھی کہ انٹرویو کے وقت جب قیدی اور اس کی بیگم اور بچے آمنے سامنے دو بنچوں پر بیٹھتے تھے اور دیکھتے تھے کہ دو طرف دو افسر بیٹھے ان کی ہر بات کو سن رہے ہیں اور ہر حرکت کو نوٹ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ جو شوق اور ولولہ انہیں اپنے عزیزوں سے ملنے کا تھا کچھ اپنی کہنے اور کچھ ان کی سننے کا تھا وہ سب ان حیوان صفت، بے حس، اور معمولی انسانی ہمدردی کے جذبہ سے نابلد افسران کی موجودگی میں سرد ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو اپنی گرفتاری کی خبر بھی نہ دی تھی اور تھانے چلا گیا تھا اس لئے کہ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیوی کو صدمہ پہنچنے کا خطرہ تھا جب وہ پہلے انٹرویو میں آئی تو ہر حساس انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اور میرے دل میں کیا کچھ نہ جمع ہو گا کہنے کے لئے۔ لیکن ایس بی اور آئی بی کے ان درندوں نے عام انسانی اقدار کو بھی پیش نظر نہ رکھا۔

تاج محمد صاحب کی بیگم صاحبہ، اور دوسرے لوگوں کی بیگمیں، بھائی رفیق کے گھر کے لوگ سبھوں کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ بیگم تاج محمد صاحب کچھ حلوہ پکا کر لائی تھیں لیکن ان کو یہ حلوہ شوہر کو نہ دینے دیا گیا اس لئے کہ کھانا جمع کرنے کا وقت گذر چکا تھا۔ ادریس صاحب کے یہاں سے دوا آئی تھی اسکے دینے کی اجازت نہ دی گئی کہ نہ معلوم اس میں کون سا ایٹم بم چھپا ہو۔ اکبر صاحب کی طبیعت ذرا خراب تھی ان کے لئے ڈاب آئے وہ بھی نہ دیئے گئے۔ اسمٰعیل کونسلر کی بیگم ذیابیطس کی

دوا لائیں تو انہیں یہ بھی واپس لے جانا پڑی ۔ زین العابدین خان کی بیگم ان کی مہندر اینڈ مہندر کی تنخواہ لے کر آئیں تو انہیں بھی یہ جیل میں جمع کر دینا پڑی ۔

سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ مطیع الرحمٰن صاحب کا وہ بچہ جو خودکشی کر کے مر ا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب اسے حالات سے نمٹنے میں ناکام ہو کر باپ سے ملنا چاہا کہ ان کی ہمدردی حاصل کرے تو اسے ان سے ملنے نہ دیا گیا اور اس کی ہمت ٹوٹ گئی ۔ اسنے مایوس ہو کر خودکشی کر لی ۔

شہاب لکھنوی کی اہلیہ بچی کی حالت انتہائی نازک تھی لیکن باوجود تین پے درپے درخواستوں کے انہیں پیرول پر ہسپتال جا کر اپنے بیوی اور بچے کو دیکھنے کی اجازت نہ دی گئی ۔ اس پر طرہ یہ کہ جب ان کا بھائی ان کے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ انٹرویو کے لئے آیا تو بچوں کو تو آنے دیا گیا اور بھائی کو روک دیا گیا اور یہ بدقسمت انسان اپنے بھائی سے بھی اپنی بیوی اور بچی کی حالت معلوم نہ کر سکا ۔ دونوں بچے ایک چار سال کی بچی اور ایک تین سال کا لڑکا تھا جب آ کر انٹرویو کے لئے بیٹھے تو ان کے دو طرف بھی دو آفیسر بیٹھے تھے جیسے یہ چھوٹے بچے بھی کسی سازش کے زبردست پیروکار تھے اور ان سے بھی حکومت ہند کو خطرہ تھا ۔ یہ غیر انسانی کردار کی ایک بدترین مثال تھی ۔

تانتی باغ کے ایک اور پریس کے مالک مہدی صاحب بھی اس بے دردی کا شکار ہوئے ان کی اہلیہ ان کی بیمار بچی کو لے کر آئیں اس بچی کو اندر نہ آنے دیا اس عذر سے کہ کوئی قیدی بیمار نہ ہو جائے اور اس طرح ایک ایسا انسان جو کبھی سیاست میں ملوث نہ رہے جس کا پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ ان آفیسران کے ظلم و ستم کا شکار ہوا ۔ حالانکہ ان کو اپنے پریس اور کاروبار کے علاوہ کسی اور مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جیل کے حکام

بھی ان کی خوش مزاجی سے ان کے گرویدہ تھے۔

ذہنی اذیت

غرض ایک انٹرویو کو کس طرح ایذا دہی کا ذریعہ بنایا گیا۔ کس طرح قیدیوں کو ذہنی اذیت دے کر ان کے غم و غصہ اور احساس بے بسی میں دیدہ دانستہ اضافہ کیا گیا اس کی مثال شاید برٹش عمل میں بھی انگریزوں کی ستم گری بھی مہیا نہ کر سکے۔ انگریز گولیاں چلاتے تھے۔ عوام کا اجتماعی قتل کرتے تھے۔ انہوں نے مغلیہ خاندان شاہزادوں کو سر بازار ذبح کر دیا۔ دلی کو ہندوستانیوں کے خون سے رنگین کر دیا۔ ہزاروں کو دار پر چڑھا دیا۔ لیکن قیدیوں کو اس طرح ذہنی اذیت نہیں پہنچائی۔ ورنہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے مجاہد ہندوستانی لیڈر گاندھی، نہرو، آزاد، قدوائی، پٹیل وغیرہ بالکل ویسے ہی مر جائے جیسے جیل سے چھوٹنے کے بعد متعدد افراد اس اذیت رسانی کا شکار ہو گئے۔ سردار پٹیل کو انگریزوں نے جسمانی اذیت دی، گوبند ولبھ پنت کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے لیکن ایسے صدمات نہ پہنچائے کہ یہ سب لوگ جیل میں نیم پاگل ہو جائیں جیل میں بند قیدیوں میں سے اکثر کی ہمت ٹوٹ جائے۔ ذہن مفلوج ہو جائیں اور وہ ذہنی طور پر زندگی کی تمنا بھی چھوڑ دیں۔

پی سی سین کی وزارت میں پولس نے جو حیوانیت اور بربریت روا رکھی اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اگرچہ خود پی سی سین نے ہم لوگوں کے سامنے نظر بندوں کی بے گناہی کا اعتراف کیا اور انہیں اس ذلیل الزام سے بری الزمہ قرار دیا کہ وہ پاکستان نواز ہیں۔ لیکن جو ذہنی اذیت انہیں پہنچائی گئی جو جانی نقصان ان کا ہوا۔ جو معزز اور مقتدر ہستیاں اس دنیا میں نہ رہیں ان کے ذہنوں اور کاروبار، ان کے خاندانوں اور سماجی پوزیشن پر جو مہلک اثرات گورنمنٹ کی طرف سے ان کی گرفتاریوں کی بنا پر مرتب ہوئے اس بدترین جرم کا کفارہ نہیں ادا

کیا جاسکتا۔ مسلمانان مغربی بنگال اس المیہ کو کئی نسلوں تک نہ بھول سکیں گے اور اس کے اثرات مسلسل سامنے آتے رہیں گے۔ اب آیئے مختصراً پھر ہم نامور اور علاقہ وار قیدیوں کے احوال کا خاکہ پیش کرتے چلیں تاکہ یہ تصنیف ایک تاریخی دستاویز بن جائے اور کم از کم آئندہ کسی حکومت کو مسلمانان مغربی بنگال کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت نہ ہو۔

بہرحال گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ جن لوگوں کو گرفتار ہونا تھا وہ ہو چکے تھے اور اس وقت جیل کی سختیاں سہ رہے تھے۔ نتائج جو مرتب ہونا تھے وہ ہوئے اور ہونگے۔ آئندہ کون سی حکومت کیسا رویہ اختیار کرے گی یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ لیکن فی الحال تو مغربی بنگال کے مشاہیر، لیڈر، سیاست داں، کاروباری، پیشہ ور، ہر شعبۂ عمل کے لوگ مغربی بنگال کے مختلف جیلوں میں تھے۔ پریسی ڈنسی جیل میں ملاجان صاحب، وقار مشرقی صاحب اور دوسرے جو لوگ تھے ان کا ذکر بھی آئے گا۔ فی الحال ہم اسپیشل جیل علی پور کے باسیوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔

کونسلر

ان میں عوام کے منتخب کردہ نمائندے بھی تھے۔ ایک ایم پی تھے سید بدرالدجیٰ صاحب مغربی بنگال میں ان کے علاوہ کوئی اور ممبر پارلیمنٹ زیر حراست نہ تھا۔ ایم ایل اے (ممبر اسمبلی) میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ لیکن کونسلر کئی تھے۔ یہ بھی عوام کے منتخب کردہ نمائندے تھے اس لئے کہ انہیں بھی رائے دہندگی بالغان کے اصول پر کارپوریشن کے الکشن منعقدہ ۱۹۶۵ء میں منتخب کیا گیا تھا۔ ایک آلڈرمین بھی تھے۔ قاضی الماس خان جنھیں کانگریس کے کونسلروں نے منتخب کیا تھا ۱۹۶۵ء میں کلکتہ کارپوریشن میں نو (۹) کونسلر اور ایک آلڈرمین مسلمان تھے۔

کانگریس کے دو کونسلر تھے، ابو حفیظ محمد اسمٰعیل اور عبدالرؤف انصاری۔ ابو حفیظ

محمد اسمٰعیل جیل میں تھے۔ انصاری صاحب باہر تھے۔ سی پی ایم کے دو کونسلر تھے۔ ڈاکٹر حق اور شمس الہدیٰ۔ ڈاکٹر حق گرفتار تھے اور شمس الہدیٰ محفوظ تھے۔ پانچ کونسلر آزاد تھے جنہوں نے ایک بلاک بنالیا تھا۔ یہ لوگ تھے کلیم الدین شمس، شہاب لکھنوی، ماسٹر شمس الضحیٰ، روح القدر کابل اور قسیم الدین اشک۔ علاوہ کلیم الدین شمس اور قسیم الدین اشک بقیہ تین یعنی شہاب لکھنوی شمس الضحیٰ اور روح اللہ کابل جیل میں تھے۔ سب ملا کر ۴ کونسلر آزاد تھے اور ۵ قید ہیں۔ اور ایک آلڈرمین جو مسلمان تھا وہ بھی قید میں تھا۔

سی پی آئی ایم کے کونسلر شمس الہدیٰ سخت بیمار تھے اور شاید اسی وجہ سے وہ بچ گئے۔ قسیم الدین اشک صرف چند دن انڈیپنڈنٹ بلاک میں رہے اور پھر وہ کانگریس پارٹی کی حمایت کرنے لگے۔ چنانچہ انہیں کی حمایت سے کارپوریشن میں میور اور ڈپٹی میور کانگریس کے منتخب ہوئے اور ان کے متعلق آلیہ گھوش کا نظریہ بھی اچھا تھا لہٰذا وہ بچ گئے۔ اب رہے رؤف انصاری صاحب اور کلیم الدین شمس صاحب تو ان کی آزادی کے متعلق ہم کوئی سبب بتانے سے قاصر ہیں۔

ڈاکٹر حق خضر پور میں اچھی پریکٹس رکھتے تھے اور سی پی آئی ایم کے ایک سرگرم کارکن اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ خاص طور پر کیونسٹ ہوتے ہوئے بھی مسلم مسائل میں پیش پیش رہتے تھے لہٰذا انہیں گرفتار کر لیا گیا اور وہ کافی عرصہ تک رہے۔ روح القدر کابل صاحب پھول بگان سے کونسلر تھے اور آزاد منتخب ہوئے تھے۔ مسلم مسائل میں یہ بھی آگے بڑھتے تھے اور انتہائی پرجوش نوجوان تھے لہٰذا ان کی گرفتاری لازمی تھی اور ہوئی۔ اسمٰعیل صاحب بڑے پرانے کانگریسی کونسلر تھے لیکن مسلم مسائل کے بارے میں بڑے بیباک اور دو ٹوک بات کرنے والے ۱۹۶۴ء میں انہوں نے جو رول ادا کیا وہ ان کی گرفتاری کے لئے کافی تھا۔ ایک مرحلے پر تو وہ بھی

کانگریس ہائی کمان کی طرف سے معطل ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یہ بھی جیل میں کافی عرصہ تک رہے اور بعد میں جب رہا ہوئے تو ان کے مرض ذیابیطیس نے اس قدر زور پکڑا کہ وہ بھی جیل کی قید و بند کے بھینٹ چڑھ گئے۔

ماسٹر شمس الضحیٰ (راجہ بازار) اور شہاب لکھنوی (جان نگر روڈ) کو ۱۹۶۴ء میں ان کی مسلم نوازخدمات کی بنا پر کانگریس سے معطل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں آزاد کھڑے ہوئے اور جیت گئے۔ دونوں کافی عرصہ تک جیل میں رہے اور شہاب لکھنوی تو آخری بیچ میں رہا ہوئے۔ لیکن اسکے علاوہ دونوں کی زندگی میں جیل جانے کے اثرات بالکل مختلف مرتب ہوئے۔

شمس الضحیٰ صاحب جیل سے رہا ہوئے تو کانگریس سے اسمبلی کا ٹکٹ ملا اور وہ دوبار ایم ایل اے ہوئے۔ خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے۔ مومن ہائی اسکول کے چیئرمین ہوئے اور ان کی زندگی ایک خاص راستے پر آ گئی جس پر وہ کامیابی سے ۱۹۷۷ء کے انتخابات تک گامزن رہے۔ شہاب لکھنوی کی زندگی اس کے بالکل برعکس رہی۔ انہیں اسمبلی کا ٹکٹ کانگریس سے ملا تو دہلی سے اسے کاٹ دیا گیا۔ کانگریس نے انہیں واپس لے کر بھی ان کے نام کے ساتھ "فرقہ پرست" کا لفظ لگا رہنے دیا۔ اتولیہ گھوش نے ان کا ٹکٹ دہلی سے منسوخ کرایا جب وہ ۱۹۶۹ء میں کارپوریشن الکشن میں کھڑے ہوئے تو معمولی ووٹوں سے اسلئے ہارے کہ انہوں نے ۱۹۶۹ء کی اسٹیشن کے سامنے پولس فائرنگ کے دوران ایک اہم کردار ادا کیا تھا اور زخمی ہوئے تھے۔

یوں جیل میں دن گذرتے گئے۔ وہ تمام لوگ جن کا اوپر ذکر آیا اور

دوسرے صاحبان جن کا ذکر اس قدر عرصہ گذرنے کے بعد ذہن فراموش کر چکا وہ لوگ بھی تھے۔ قریب ڈیڑھ ہزار افراد کا فرداً فرداً ذکر کیا جائے تو اس مختصر سوانح کی ضخامت بہت بڑھ جائے گی اور اکتا دینے والی حد تک طویل ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم نے چند لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً چیت پور گروپ میں کئی احباب کے نام چھوٹ گئے جیسے گلزار بوٹ ہاؤس والے گلزار صاحب اور ایسو ایٹیڈ ٹریڈرس والے محمود صاحب، یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ کامریڈ ہاشم بھی ساتھ تھے۔ ماسٹر موسیٰ (چوڑی پاڑہ) بھی تھے۔ مٹیا برج کے متعدد لوگ تھے۔

بنگالی بھائیوں کی ایک خاصی تعداد تھی جن میں مولانا غلام علی صاحب کے ساتھیوں کے علاوہ بروئی پور، جے نگر، ڈائمنڈ ہاربر اور چوبیس پرگنہ کے متعدد علاقوں کے درجنوں بھائی جیل میں تھے۔ ان کا ذکر مختصراً اس لئے کیا جا رہا ہے کہ زیادہ تر وہ ایک تو اپنے اپنے گروپوں میں رہے اور ساتھ ہی بود و باش رکھی۔ دوسرے یہ کہ اردو میں جیل کی روداد ان کی دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتی۔ ورنہ ان کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور اگر کبھی بنگلہ زبان میں کوئی کتابچہ نکلا تو ان کا ذکر کیا جائے گا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اگر ہمارے بنگالی بھائی ساتھ نہ دیتے تو کانگریس کو جو سبق ۶۷ء اور ۶۹ء میں دیا گیا وہ مکمل نہ ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان ہی کانگریس کو اپنے ۹۰ فیصد ووٹ دے کر مغربی بنگال میں کامیاب کرتے تھے اور ان میں بنگالی بھائیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ہے۔ سید بدر الدجیٰ صاحب نے جب اپنی ایک پارٹی ۶۷ء میں بنائی تھی تو انہوں نے مغربی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی، ووٹ اور ان کی اہمیت کا ایک مکمل جائزہ لیا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ مغربی بنگال کے ۹ اضلاع میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت ۵۰ اسمبلی کی نشستوں میں ۵۵ فیصد سے ۸۵ فیصد

ہے اور ایک سو مزید نشستوں میں وہ اتنے اوسط میں ہیں کہ ان کے ووٹ کے بغیر جیت ناممکن ہے لہذا اگر مسلمان مغربی بنگال میں منظم ہو کر ڈٹ جائیں تو مغربی بنگال میں کوئی بھی پارٹی ان کی حمایت کے بغیر حکومت نہیں بنا سکتی۔

بدرالدجیٰ صاحب کے اس بیان کا ثبوت ہمیں یوں ملتا ہے کہ جب مسلمان کانگریس کے ساتھ تھے تو کانگریس کو کوئی ہرا نہ سکا اور جب اس نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے مسلمانوں کی حمایت کھو دی تو اسے دنیا کی کوئی طاقت فتحیاب نہ کر سکی ۶۷ء کے انتخابات میں بائیں بازو کی پارٹیاں منظم نہ تھیں اندرا کانگریس کولیشن گورنمنٹ بنانے میں کامیاب ہو گئی لیکن ۶۹ء میں مسلمانوں کے ووٹوں نے اسے مغربی بنگال کے نقشے سے ختم کر دیا۔ ۷۱ء میں دوبارہ جب اندرا گاندھی نے قیادت ایک مسلم دوست لیڈر سدھارتا شنکر رائے کے سپرد کی اور مسلمانوں کا اعتماد واپس آیا تو انہوں نے کانگریس کی ایک اور کولیشن گورنمنٹ کو چانس دیا ۷۲ء میں اندرا گاندھی اور سدھارتا رائے کی جوڑی نے مسلمانوں کا مکمل اعتماد حاصل کر لیا تو اسے وہ کامیابی نصیب ہوئی جو اپنی مثال آپ ہے پھر ۷۷ء میں نس بندی، ایمرجنسی اور سنجے گاندھی کی ترکمان گیٹ والی پالیسی نے دوبارہ مسلمانوں کا اعتماد کھو دیا تو پھر کانگریس بساط سیاست سے ختم ہو گئی۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کے رویہ نے یہ ناقابل تردید ثبوت مہیا کر دیا کہ اگر کسی پارٹی کا ساتھ مسلمان نہ دیں تو وہ مغربی بنگال میں برسر اقتدار نہیں رہ سکتی۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کو بساط سیاست پر اس قدر اہمیت حاصل ہے اور انہیں اس کا احساس بھی یقیناً ہوگا تو پھر ان کو مغربی بنگال میں کوئی آزادی کیوں نہیں جبکہ دوسرے مقامات پر ان سے بہت کم تعداد میں متحد مسلمان بہت کچھ پا چکے ہیں جواب یہ

ہے کہ مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی صحیح لیڈر شیخ عبداللہ یا اسمٰعیل صاحب کی طرح انھیں کبھی نہیں ملا۔ سوا ملا جان صاحب اور بدرالدجیٰ صاحب کے جنھیں آپس میں لیڈرشپ کے بارے میں یک جہتی نہ ہو سکی۔ باقی جو بھی مغربی بنگال میں ابھرا وہ یا تو موقعہ پرست تھا یا مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا۔ ان دونوں لیڈروں کی طرح خلوص کسی میں بھی نہ تھا۔

ایک اور وجہ جو مسلمانان مغربی بنگال کی اس عظیم اکثریت کو صحیح معنوں میں کام نہیں لانے دیتی۔ بنگالی اور غیر بنگالی کا فرق ہے۔ غیر بنگالی مسلمان زیادہ تر کلکتہ اور مضافات میں آباد ہیں جس میں مضافات میں رہنے والی اکثریت کس مپرسی کی شکار ہے —— کلکتہ کے مشہور ترین اور انتہائی متمول افراد جیل میں بند تھے لیکن سب غیر سیاسی تھے۔ کلکتہ کے مسلمانوں کے پاس دولت ہے۔ علم ہے۔ کاروبار کی صلاحیت ہے۔ وہ مغربی بنگال کے دوسرے مسلم بھائیوں سے تعلق پیدا کرکے ایک فضائے اتحاد پیدا کر سکتے ہیں لیکن انھیں اپنے کاروبار سے اتنی فرصت نہیں۔ ہاں دامے درمے وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہیں کلکتہ سے ہر سال لاکھوں روپے سارے ہندستان کے اداروں کو جاتا ہے۔

ضرورت ایک ایسے لیڈر کی ہے جو ان مسلمانوں کو جو کلکتہ اور مضافات میں رہتے ہیں ان کے دوسرے بنگالی بھائیوں کے قریب لائے جو مغربی بنگال کے دیہاتوں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں جنھیں اب بھی تعلیم کا چرچا زیادہ نہیں ہے جو شہروں سے دور رہتے ہیں چنانچہ ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی بڑے بڑے شہروں میں ہے وہ اقلیت میں ہیں۔ اب مرشدآباد ڈسٹرکٹ ہی کو لیجیے یہاں کی ۱۸ اسمبلی کی نشستوں میں سے ۱۲ میں مسلمان ووٹروں کی اکثریت ہے اور وہ جس کو چاہتے ہیں کامیاب کرتے ہیں لیکن برہم پور، مرشدآباد وغیرہ شہروں میں وہ اقلیت میں ہیں۔ اسی طرح

اور جگہوں پر بھی حالات یکساں ہی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس علیحدگی پسندی کو دور کیا جائے۔

اس سلسلے میں بھی ایک کوشش سدھارتھ شنکر رائے ہی نے کی اور وہ بردوان، مالدہ، مرشد آباد کے مسلم لیڈروں کو رائٹرس بلڈنگ لائے، وزارتیں دیں، پردیش کانگریس اور یوتھ کانگریس میں عہدے دیئے اور اس طرح کلکتہ کے کاروباری مسلمانوں سے انھیں متعارف کرایا۔ لیکن یہ بات کچھ آگے اس لئے نہ بڑھ سکی کیونکہ مسلم لیڈروں میں یہاں بھی کرسی کی جنگ شروع ہو گئی اور آپسی اختلافات مضحکہ خیز حد تک سنگین ہو گئے۔ یہ دوچار دن کے سیاست دان اپنے کو ارسطوئے دوراں سمجھنے لگے اور یہیں دوبارہ مسلمانان مغربی بنگال کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ یہ لوگ خود آپس میں متحد نہ ہو سکے تو مسلم عوام کو کیا متحد کرتے۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا یعنی صفر۔ مسلمان جہاں تھا وہیں ہے اس کی اس زبردست طاقت اور سیاسی وزن سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں اور نہ اسے اسکی اہمیت بتانے والا کوئی ہے کہ اگر وہ متحد ہو جائے تو مغربی بنگال کی کوئی پارٹی اس کی مرضی کے بغیر حکومت نہیں بنا سکتی اور اس طرح وہ چاہے تو مغربی بنگال میں حکومت گر ہو سکتا ہے۔

رہائی

گرفتاریاں رک چکی تھیں۔ آخری گرفتاری محمد طاہر (ٹارزن) کی تھی جو شمس الہدیٰ روڈ کے ایک سرگرم سوشیل ورکر تھے اور عام گرفتاریوں کے چار روز بعد اپنے دفتر سے گرفتار ہو کر آئے تھے۔

اب گرفتاریوں کے ٹھیک انیسویں روز جبکہ التوائے جنگ ہو چکا تھا۔ یکایک ایک روز شام کو سارے قیدیوں کے بند ہونے کے بعد رہائی پانے والوں کی ایک لسٹ لے کر جیلر صاحب آئے اور تمام کمروں میں گھوم گھوم کر ان لوگوں کو اکٹھا کرنے لگے جو ان قیدیوں میں سب سے

زیادہ خوش قسمت تھے اور جنھیں آزادی کی فضا میں واپس جانا تھا۔ یہ لسٹ بہت مختصر تھی اور اس میں ان خاص خاص لوگوں کے نام تھے جن کے پشت پناہ حکومت کے بڑے بڑے لوگ تھے اور جنھیں وہ پہلی فرصت میں نکال لینا چاہتے تھے۔ ان برسر اقتدار جنادری لوگوں کو اپنے محبوب نظربندوں کی گرفتاری کی پیشگی اطلاع نہ تھی ورنہ انھیں گرفتار ہی نہ ہونے دیتے۔

رہائی پانے والے اس پہلے گروپ کی سب سے اہم شخصیت مفتی مولانا غلام علی صاحب (منگراہاٹ) کی جو خاص آرد ھندو شیکھر نسکر وزیر پولس کے حلقۂ انتخاب کے علاقہ کے ایک انتہائی بااثر مولانا تھے جن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ان کے آٹھ لاکھ مرید ہیں اور مولانائے موصوف کی رضامندی یا ناراضگی کا اثر چھ اسمبلی حلقوں پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انھیں پہلے نکالا گیا۔ لیکن اثرات مرتب ہو چکے تھے اور ۶۷ء کے انتخابات میں ان اسمبلی علاقوں میں جہاں کانگریس ہمیشہ کامیاب ہوتی تھی ایک بھی نشست اسے نہ مل سکی۔ بہرحال پہلی لسٹ میں ہی مولانا غلام علی اور ان کے چھ ساتھی آزاد کر دیئے گئے۔

رہائی کا سلسلہ

بہرحال اب رہائی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ دوسرے روز سے صبح شام فہرستیں آتی رہیں اور خوش قسمت افراد رہا ہوتے رہے۔ ایک ہفتہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران عجیب عجیب واقعات ہوئے۔ ایک صاحب جو نارتھ رینج میں رہتے ہیں اور خضرپور کے ایک لیڈر کے دست راست ہیں۔ وکیل بھی ہیں۔ ان کی حرکات جیل میں بڑی مشتبہ رہیں۔ جب دوسرے لوگ بند کر دیئے جاتے تھے تب بھی یہ صاحب آزاد گھومتے تھے اور جیل کے دفتر میں ۹ بجے رات تک نہ معلوم کیا کچھ کرتے تھے پھر اپنے بستر پر آکر رات کو کچھ لکھتے رہتے تھے جو صبح غائب ہو جاتا تھا لہٰذا سید بدرالدجیٰ صاحب نے اپنے کمرے میں ان کو آنے

کی ممانعت کردی تھی۔ جب رہائی شروع ہوئی تو یہ صاحب بھی نکلے لیکن اس حالت میں گھر جاتے جاتے سب سے معافی مانگتے جا رہے تھے۔ نہ معلوم کس بات کی معافی مانگ رہے تھے۔ کیا ان کا مجرم ضمیر انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میری رہائی

بہر حال ۲۱ روز کی گرفتاری اور قید کے بعد میں اور میرے بھائی رفیق اور یوسف صاحبان بھی رہا ہو گئے۔ بعد کی تفصیل رئیس اور شہاب سے معلوم ہوئی جو آخری گروپ میں رہا ہوئے اور جیل میں ۴ ماہ ۱۹ دن تک رہے۔ یوسف بھائی کی رہائی کے دوران ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ جیل کے دفتر سے خبر آئی کہ یوسف صاحب کی رہائی کا پروانہ آیا ہے لہذا جیل میں جتنے بھی یوسف نام کے لوگ تھے سبھوں کو فطری طور پر یہ امید بندھی کہ وہ رہا ہو جائینگے یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ لیکن سب منتظر رہے کہ دیکھیں کس یوسف کی قسمت جاگی ہے لیکن خواجہ محمد یوسف صاحب کو باہر سے خبر ملی تھی کہ وہ جلد رہا ہو جائیں گے۔ لہذا وہ تیار ہو گئے۔ کپڑے پہن لئے سامان ٹھیک کر لیا۔ اور اپنے دوستوں سے رخصت بھی ہوئے۔ لیکن جب جیلر نے آکر فہرست میں نام سنائے اور باپ کا نام پڑھ کر سنایا تو میرے بھائی یوسف نکلے جو اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس مرتبہ خواجہ یوسف صاحب کو مایوس ہونا پڑا لیکن ان کی اطلاع صحیح تھی اور انھیں بھی جلد ہی رہائی مل گئی اسی طرح اور بہت سے لوگ جن کے نام ایک سے تھے اس امید و بیم کی حالت کا شکار ہوئے اور جیل میں لسٹ کے آنے پر یہ بھی ایک تفریح رہتی تھی کہ اندازہ کیا جائے کہ کون جائے گا۔

حیرت انگیز

ایک اور حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز صبح حاجی محمد قاسم صاحب (الیمیٹ روڈ) سو کر اٹھے تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھ ہے کہ میں رہا ہو گیا ہوں لہذا آج صبح میں رہا ہو جاؤں گا۔ اتفاق سے صبح تو نہیں لیکن اسی

روزان کے نام رہائی کا پروانہ آگیا اور وہ چلے گئے۔

ددبے کی شامت

بھائی رفیق کی رہائی کے وقت بھی ایک عجیب اتفاق ہوا جب رفیق صاحب کی رہائی کا آرڈر آیا تو اتفاق سے ددبے جیل کے دفتر میں موجود تھا حالانکہ وہ عموماً قیدیوں کی رہائی کے وقت چپکے سے کھسک جاتا تھا۔ بھائی رفیق نے اسے دیکھ لیا اور اسے اس قدر گالیاں دیں کہ اندر انھیں سن سن کر قیدیوں کے دل خوش ہو گئے۔ رفیق بھائی نے اس کو چیلنج کیا کہ وہ اسکے اس متعصب رویہ کی سزا ضرور دلوائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ہماری بے عزتی کرنے اور قوم کے دامن کو بدنامی کے داغ لگانے والے سب انسپکٹر ددبے کو بارک پور آرمری میں ٹرانسفر کر دیا گیا جہاں ان کے زہریلے ذہن کو مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔ اور حکومت کو بھی پتہ چل گیا کہ ددبے نے اس کا کس قدر نقصان کیا ہے

بانڈ

رہائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا اور وہ لوگ سارے کے سارے کم و بیش نکل گئے جو خواہ مخواہ دھر لیے گئے تھے اور ان کے خلاف کوئی رپورٹ یا ثبوت حکومت یا پولس کے پاس نہ تھا۔ اب وہ چند سو لوگ جیل میں رہ گئے جن کے خلاف کوئی بھی رپورٹ تھی۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جن کے خلاف دشمنی میں پولس نے رپورٹ دے دی تھی۔ اکثر ایسے بھی تھے جو سوشیل ورکر یا لیڈر تھے لیکن پولس نے ان کی سرگرمیوں کو مسلم دوستی سے بڑھ کر فرقہ پرستی کا لباس پہنا دیا تھا اور صرف اسی بنا پر کہ وہ مسلمانوں کی مصیبت اور دشواریوں کے وقت ان کے کام آتے ہیں یا ان پر مظالم ہوتے دیکھ کر احتجاج کرتے ہیں۔ کچھ کاروباری صرف چندہ وغیرہ دینے کے الزام ہی میں ماخوذ کر لئے گئے تھے۔

اب سامنے سوال یہ تھا کہ پوجا کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں اور قیدیوں کو باہر سے

یہ خبر مل چکی تھی کہ جو لوگ پوجا کے پہلے چھوٹ گئے وہ چھوٹ گئے۔ باقی چھٹیوں کے اختتام تک ماہ ڈیڑھ ماہ تک سڑ جائیں گے

ادھر حکومت اور پولس کو اس کا خیال تھا کہ اب کسی طرح ان کی گرفتاریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کچھ کیا جائے تاکہ عوام میں یہ بات نہ پھیلے کہ پاکستان سے جنگ رکتے ہی سب کو چھوڑ دیا گیا چنانچہ گرفتار شدہ مسلمانوں پر کوئی الزام ملک و قوم دشمنی کا نہ تھا صرف پاکستان سے جنگ کی وجہ سے انھیں بے گناہ بند کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب حکومت نے ایک نئی چال چلی اور قیدیوں سے یہ کہا جانے لگا کہ بانڈ دے دیں کہ وہ آئندہ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں۔ اپنی رہائی کے لئے پریشان کچھ لوگوں نے بانڈ بھر دیئے اور رہا کر دئے گئے۔

قیدیوں میں بیشتر اس نئی جدت پر بڑے برافروختہ ہوئے۔ اور انہوں نے احتجاجاً یہ فارم واپس بھی کر دیئے۔ چند ایسے لوگ جنھیں سیاست سے واقعی کوئی تعلق نہ تھا اور جلد از جلد واپس جانا چاہتے تھے انہوں نے بانڈ بھر دیئے۔ لیکن ایسے اکثر لوگوں نے اس بانڈ کے فارم کو اپنی ہتک محسوس کیا اور فارم نہ بھرے اگرچہ وہ بے گناہ پکڑے گئے تھے اور اس دہری بے عزتی پر قید و بند کو ترجیح دی۔ یہ بلا شک و شبہ مسلمانوں کے صبر و ضبط کا ایک زبردست امتحان تھا جس میں وہ پورے اترے اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ انھیں غیر مشروط طور پر رہا کرے۔

بہرحال پوجا کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور جو لوگ باقی تھے وہ بدستور قید رہے۔ لیکن اب جیل کا پورا اسٹاف یہ سمجھ چکا تھا کہ جتنے بھی لوگ یہاں قید ہیں وہ سب کے سب کلکتہ کی مسلم سوسائٹی کے اونچے معیار کے لوگ ہیں۔ شریف اور قابل احترام ہیں لہذا انہوں نے نظر بندوں

کو زیادہ آزادی جیل کے اندر دے دی تھی۔ خصوصاً یوں بھی کہ ایک عادی قیدی نے جب سید بدرالدجیٰ صاحب کے ساتھ گستاخی کی تھی تو اسے شہاب لکھنوی نے اتنا پیٹا کہ جیل کی "پگلی گھنٹی" بج گئی۔

جیل ہی میں شاندار میلاد شریف ہوا اور خود جیلر نے اپنے گھر سے غالیچہ گل دان اور دیگر لوازمات لاکر مہیا کئے گئے۔ اجمیر شریف میں جب خواجہؒ کا عرس ہوا تو جیل میں بھی یہ تقریب منائی گئی۔ غرض ہر طرح کی سہولت جیل کے اسٹاف نے نظر بندوں کو دی۔ یہاں تک کہ جیل میں کمرے کے اندر چولہا جلانا سخت منع ہے لیکن کراسن تیل کے اسٹو ہر کمرے میں جلتے تھے۔ کھانے کی چیکنگ پہلے پہل تو بڑی سخت تھی لیکن بعد میں اس پر کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی اور جس کا جو جی چاہتا تھا پکواتا تھا اور کھاتا تھا۔

پوجا کی چھٹیاں ختم ہونے کے ایک ماہ بعد پھر رہائیوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ صرف ۲۴ / افراد رہ گئے۔ یہ ۲۴ / افراد اس وقت بھی قید رہے جب کہ پاکستانی جہازی نظر بندوں کی بھی رہائی ہو گئی۔ ان افراد میں سے ۲۰ / افراد کو عید سے تین روز پہلے چھوڑا گیا اور بقیہ چار افراد کو چند روز بعد۔ اس طرح علی پور اسپیشل جیل میں ۱۳۸۷ / افراد کی رہائی مکمل ہو گئی۔

حرفِ آخر

...... یہ سب کچھ ہوا۔

مگر جیل سے رہائی کے بعد ہم اس معصوم بچے کی طرح حیران تھے جسے کبھی کبھی بلا قصور ان کے بزرگ طمانچے مار دیتے ہیں۔ ہم پریشان تھے کہ ہم قید میں کیوں تھے؟ ہم پر کیا الزام تھا؟ وطن دشمنی کا؟ تو پھر اب کیا ہوا؟ چند ماہ جیل میں رہ کر کیا اب ہم وطن دوست ہو گئے؟ اور اس کا فیصلہ کس عدالت نے کیا؟ ہماری وفاداریاں مشکوک تھیں اور ہم سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیئے گئے قید کر لئے گئے مگر اس قید سے باہر نکلتے وقت ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہم صحیح طور پر سزادار تھے یا ہم پر وطن دشمنی کا الزام غلط تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل سے باہر نکلنے کے بعد اپنی بے گناہی اور بے بسی کے احساس نے ہمیں ذہنی طور پر اور بھی منتشر کر دیا ایسا لگا یہ رہائی قید کی ایک دوسری شکل ہے جس نے ایک بڑے جیل میں مقید کر دیا ہے۔ سزا بھی طویل کہ ۵ ابرسوں سے بھگت رہے ہیں اور اس کی حد بھی متعین نہیں کہ آخر اس ذہنی کرب اور صعوبت کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ اب تک کسی نے نہیں بتایا کہ ہمارا مقدمہ کس عدالت میں ہیں، پھر بھی ہم اپنے لئے کسی فیصلہ کا انتظار کرنے پر مجبور ہیں ملک میں بڑی بڑی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کانگریس نے اقتدار کھویا۔ پھر نئی کانگریس سامنے آئی۔ اندرا جی کا دور حکومت شروع ہوا۔ پاکستان سے ایک پھر جنگ ہوئی۔ ملک میں ایمرجنسی لگا۔ اور تب ۱۹۷۷ء کا تاریخی سال شروع ہوا۔ جنتا نام کی حکومت برسر اقتدار ہوئی۔ گاندھی کی سمادھی پر قسمیں کھائی گئیں۔ حق و انصاف کے لئے لڑنے کا عہد نامہ تیار ہوا۔ پچھلی حکومت کے ظلم و ستم کا جائزہ لیا گیا۔ کمیشن مقرر ہوئے۔ عدالتیں بیٹھیں۔ سیاسی سطح پر سارا کچھ ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ مسلم کش فسادات بھی ہوتے رہے۔ فرقہ

پرستی کا زور بھی بڑھتا رہا۔ اور جنتا حکومت بھی ٹوٹی۔ ہندستان کے لوگ مبارکباد میں کہ پہلی بار فرقہ پرستی کے خلاف لڑتے ہوئے حکومت الٹ دی گئی۔ اور اب ملک کو ایک نیا الیکشن درپیش ہے۔ سماج میں ظلم وستم کے خلاف لڑنے والے سیاسی رہنماؤں کے اس تیور کو دیکھتے ہوئے ہمارا زخم تازہ ہو گیا ہے۔ ہم اپنا قصور جاننا چاہتے ہیں۔ ہم انصاف مانگتے ہیں۔ ہم اپنی سزا کی میعاد معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے اپنی نوکریاں گنوائی ہیں۔ ہمارا کاروبار تباہ ہوا ہے۔ ہم ذہنی تناؤ میں گرفتار رہے ہیں۔ احساس کمتری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہم پر برے وقت آئے۔ لیکن اچھی ملازمتوں سے محرومی کے بعد ہم نے فٹ پاتھ پر اپنی روزی روٹی کا سامان ڈھونڈا۔ کاروبار تباہ ہوا تو چھوٹی موٹی ملازمتوں پر ہم نے قناعت کی۔ مگر ایک احساس سے چھٹکارا نہیں مل سکا کہ آخر ہم بے گناہوں کو کیوں قید کیا گیا تھا؟ ہماری وفاداری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے والے اپنے حافظے کا علاج کیوں نہیں کرلیتے؟ ہندستان کی جنگ آزادی اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر میں ہمارے برابر کے حصوں کو لوگوں نے کیا دل سے فراموش کر دیا؟ ہم اپنی خدمات کا گوشوارہ پیش کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ ہندستانی قومیت کا تصور ہمارے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ ہم تو صرف ہندستان کے تمام مہذب اور امن پسند شہری، اسمبلی کے موجودہ اور آنے والی پارلیامنٹ کے متوقع ممبران اور ملک کے صدر سے اس بات کی ضمانت چاہتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء میں اگر ہمارا کوئی قصور تھا تو اس کی نشاندہی کی جائے اور اگر ہم معصوم اور بے قصور تھے تو اس وقت کے ذمہ داروں کو ان کے غیر انسانی زیادتیوں کی مناسب سزا دی جائے۔

..... آپ کی کتاب میں نے بہت سنبھل سنبھل کر پڑھی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر آپ نے ۱۹۶۵ئہ کی ہند پاک جنگ کے پس منظر میں قلم اٹھایا ہے۔ پہلے تو حیرت ہوئی کہ پندرہ برس کے بعد آپ نے اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ پھر بعد میں اطمینان ہوا کہ اس عرصہ میں آپ کو ہندوستانی سیاست کے تجربے بھی ہوئے اور اسباب و نتائج نے آپ کی تحریر میں جذباتیت کے غلبہ کو کم کیا۔ غیر متعصب، سیکولر اور ترقی پسند سیاسی افراد اور جماعتوں کی پہچان، اب مسلم اقلیت کا اولین فرض ہونا چاہئے۔ بہ صورت دیگر حشر معلوم ہے۔ اب تجربہ کرنے کا شوق ختم ہو جائے، اس میں بھلائی ہے۔

منظر کاظمی، جمشید پور
۱۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ئہ



..... **شہزادہ سلیم** کو اردو دنیا غالباً ایک صحافی کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے لیکن رہبرِ عالم، عکاس اور بھیر تلاں کی موجودہ ادارت اُن کی ضرورت یا مجبوری نہیں، ان کا شوق ہے البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اظہارِ شوق کا یہ وسیلہ بھی انہوں نے وقت کے کسی ناگزیر تقاضے کی بنیاد پر اختیار کیا ہے لیکن ان کی شریکِ حیات ہونے کے ناطے میں نے انہیں کسی اور نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ـــ مسئلہ یہ ہے کہ میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ـــ تمام دنیاوی مسرتوں کے بعد بھی، یہی سبب ہے کہ ایک بے نام سا خوف ذہن پر طاری رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے دوران میں نے ایکبار ان سے کہہ دیا تھا کہ بہتر ہوتا اگر آپ ایک اور شادی کر لیتے ـــ مجھے یاد ہے کہ وہ بہت جذباتی ہو گئے اور حسبِ عادت ایک تقریر انہوں نے کر ڈالی۔ مدعا اس تقریر کا یہ تھا کہ جو حق ہم آپ کو دے نہیں سکتے وہ آپ سے ہم لے کیسے سکتے ہیں؟ یعنی جب ایک مرد اپنی بیوی کو دوسری شادی کا مشورہ دینے کی ہمت نہیں کر سکتا تو آخر وہ یہ کام خود کیسے کر سکتا ہے ......؟

میرے لئے ان کا یہ جذبہ، ان کا یہ نقطۂ نظر اور ازدواجی زندگی کے تقدس کا یہ احترام، ایک دولت ہے۔ زندہ رہنے کا میرے لئے اس سے بڑا سہارا اور کیا ہو سکتا ہے؟

اُن کی اس کتاب میں (جو اُن کے لکھنے کے دوران ہی پڑھتی چلی گئی) میرا بھی حصہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں جب وہ قید کر لئے گئے تھے تو جدائی کے یہ ایام مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے۔ لیکن میں اس کی داد نہیں چاہتی کہ اُن کے تمام غموں کو سمیٹ لینے کا حوصلہ بھی اُنہیں کا بخشا ہوا ہے۔

ثریا سلیم

۱۴/فا، گوراچاند روڈ - بنیاپوکھر، کلکتہ - ۱۴